اُردو

۱ - یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوا کرتا ہے۔

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے۔ حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے اور اکثر زیادہ۔

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے۔ نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

۴ - مضامین وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱، دریاگنج دہلی سے خط و کتابت کرنی چاہیے اور رسالے کی خریداری اور دیگر انتظامی امور کے متعلق منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کو لکھنا چاہیے۔

المشتہر

انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، دہلی

نرخ نامہ اجرت اشتہارات «اردو»

کالم	ایک بار کے لیے	چار بار کے لیے
دو کالم یعنے پورا ایک صفحہ	۸ روپے	۳۰ روپے
ایک کالم (آدھا صفحہ)	۴ روپے	۱۵ روپے
نصف کالم (چوتھائی صفحہ)	۲ روپے ۴ آنے	۸ روپے

جو اشتہارات چار بار سے کم چھپوائے جائیں گے ان کی اجرت کا ہر حال میں پیشگی وصول ہونا ضروری ہے، البتہ جو اشتہارات چار یا چار سے زیادہ بار چھپوایا جائے‌گا اس کے لیے یہ رعایت ہوگی کہ مشتہر نصف اجرت پیشگی بھیج سکتا ہے اور نصف چاروں اشتہار چھپ جانے کے بعد۔ منیجر کو یہ حق حاصل ہوگا کہ سبب بتائے بغیر کسی اشتہار کو شریک اشاعت نہ کرے یا اگر کوئی اشتہار چھپ رہا ہو تو اس کی اشاعت کو ملتوی یا بند کردے۔

المشتہر

انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، دہلی

اُردُوْ

نمبر ۸۲	اپریل سنه ۱۹۴۱ع	جلد ۲۱

انجمن ترقیٔ اردو (ہند)

کا

سه ماہی رساله

مقام اشاعت:— دہلی

رشید احمد ایم۔ اے نے لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی میں چھپوا کر
انجمن ترقیٔ اردو (ہند) دہلی سے شایع کیا ۔

اُردو

اپریل سنہ ۱۹۴۱ع

فہرست مضامین

انیسویں صدی میں مدراس کے اردو اخبار

(افضل العلما ڈاکٹر محمد عبدالحق پرنسپل گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس)

مدراس کے اردو اخبارات پر مضمون لکھنے کا خیال ایک مدت سے دل میں جاگزیں تھا، لیکن قدیم اخبارات کو فراہم کرنا ایک ایسا مشکل امر ہے کہ باوجود پیہم کوششوں کے جب میں اس میں کامیاب نہ ہوسکا تو تکمیل مضمون کے خیال کو ہمیشہ ملتوی کرنا پڑا۔ اس خیال کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ مجھ کو اپنے والد صاحب قبلہ مدظلہ کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ آج سے تقریباً پچاس ساٹھ سال پہلے شمالی ہند کے بعض عربی مدارس میں مدراس کا شمس‌الاخبار بےحد مقبول تھا اور اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ اخبار بہ‌مقابلہ دیگر اخبارات کے اسلامی اور بیرونی ممالک کی خبریں بہ‌کثرت شایع کیا کرتا تھا۔ میرے محترم بزرگ ایڈیٹر صاحب رسالۂ اردو نے بھی اس بات کی تصدیق کی اور یہ ترغیب دلائی کہ مدراس کے قدیم اردو اخبارات پر ایک مضمون لکھا جائے، میں نے وعدہ تو کرلیا لیکن ہمیشہ ایفا سے گریز کرتا رہا اور یہ یقین ہے کہ اگر مولوی صاحب کا شدید تقاضا اور انجام‌کار ان کے عتاب کا خوف نہ ہوتا تو شاید ہی یہ وعدہ پورا ہوتا[1]۔ اس مختصر سے مضمون میں میں نے اس امر

---

۱ مولوی صاحب کا عتاب آمیز خط جس نے مجھے اس مضمون کے پورا کرنے پر مجبور کیا درج ذیل ہے:۔
''حضرت، جولائی کیا اگست بھی گزر گیا۔ آپ کے مقالہ کا اب تک انتظار ہے۔ کب تک انتظار کرائیے گا۔ میرے بعد اگر مکمل ہوا تو یہ حسرت میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا، وقت گزرتا جاتا ہے، حالات بدلتے جاتے ہیں، جو کچھ کرنا ہو کر لیجیے نہ معلوم کل کیا ہوتا ہے۔ اب جس طرح بن پڑے تکمیل کر کے بھیج دیجیے اور وقت کا تعین کرکے لکھیے کہ کب تک میرے پاس پہنچ جائے گا ....یہ دونوں کام

بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۷۲

کی کوشش کی ہے کہ مدراس اور اس کے اضلاع کے بعض قدیم اردو اخبارات کے متعلق مفید معلومات یکجا جمع کردیے جائیں اور بہت ممکن ہے کہ میں بعض ایسے اردو اخبارات کا ذکر کرسکوں جو اس صوبے میں زبان اردو کے حقیقی خادم تھے۔ جن اخبارات کی جلدیں اور بعض متفرق پرچے میرے پیش نظر ہیں ان کی بنا پر میں نے اس امر کا التزام کیا ہے کہ ۱۸۴۸ع سے ۱۹۰۰ ع تک کے اردو اخبارات کا مجمل تذکرہ مرتب ہوجائے ۔ یہ امر آسان نہیں ہے کہ میں اپنے مضمون میں ان تمام اردو اخبارات کا ذکر کرسکوں جو اس صوبے میں جاری ہوئے کیونکہ قدیم اردو اخبارات کی جلدیں بالعموم کمیاب ہیں اور صوبۂ مدراس کے اردو اخبارات کی جلدیں تو تقریباً ناپید ہیں، باوجود اس کے میں نے مدراس اور بنگلوز کے اکثر اخبارات کا ذکر کیا ہے لیکن جن کی اشاعت کا مجھے علم نہ ہوسکا ان کے متعلق واقف‌کار حضرات اگر رسالۂ اردو کے صفحات میں مفید معلومات پیش کرسکیں تو میری یہ کوشش یقیناً کارآمد ثابت ہوگی ۔

اب تک اردو اخبارات کے متعلق جو معلومات بہم پہنچے ہیں ان کی بنا پر یہ ظاہر ہے کہ اردو کا پہلا اخبار دھلی سے مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر صاحب کی ادارت میں ۱۸۳۶ ع میں جاری ہوا، اس کے بارہ سال بعد ہی مدراس میں اردو اخبار شایع ہونے لگے۔ سب سے پہلا اخبار جو مجھے دستیاب ہوا ہے وہ ۱۸۴۸ع میں جاری ہوا تھا، غالباً اس کا پہلا نمبر محرم ۱۲۶۵ ھ میں نکلا تھا اور یہ ہی مدراس کا قدیم ترین ہفتہ وار اردو اخبار ہے ؛ اس کے پہلے صفحہ پر اکثر فورٹ سینٹ جارج گزٹ کے اعلانات طبع ہوتے تھے، نام کے ساتھ تک‌بندی کی عجیب مثال ذیل کے فقروں سے ظاہر ہے :—

« اعظم‌الاخبار » پنجشنبہ روز اشتہار، قیمت یک روپیہ ماہوار، پیشگی دس روپے سال کو یک بار، محصول ڈاک ذمہ خریدار ۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۱

آپ ہی کے کرنے کے ہیں اور آپ ہی کو کرنے پڑیں گے ۔ میری زندگی میں ان سے آپ کو چھٹکارا نہیں مل سکتا ۔

روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو — دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا — ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

نیازمند عبدالحق"

اخبار کا نام غالباً نواب غلام غوث خاں بہادر متخلص بہ اعظم بانیِ مدرسہ اعظم مدراس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تھا، پہلے پہل اردو اخبارات کے اجرا سے مقصد شاید یہی تھا کہ نوابوں اور رئیسوں سے بذریعہ خوشامد تحصیل زر کی صورت نکل آئے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اکثر قدیم اخبارات اپنی قیمتیں متفاوت مقرر کیا کرتے تھے۔ اعظم‌الاخبار کا جو نمبر میرے پیش نظر ہے وہ ٦ محرم ١٢٦٦ھ مطابق ۲۲ نومبر ۱۸۴۹ ع کا ہے۔ اس میں مقامی کیفیتیں درج ہیں۔ اس کے علاوہ حیدرآباد، جالنہ، گووا، بمبئی اور ملتان کے متعلق خبریں مندرج ہیں، حیدرآباد کی خبر میں روہیلوں، افغانوں اور سکھوں کی ان تجاویز اور سازشوں کا ذکر ہے جو راجہ نانک بخش کو گرفتار کرنے کے لیے کی گئی تھیں۔

اس اخبار میں رسم‌الخط کی ایک یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ ہر جگہ "یا" اور "واو مجہول" کو معروف متمائز کیا گیا ہے اور مجہول "یا" اور "واو" پر اس قسم کے نشان پائے جاتے ہیں:۔ "w ‘o ‘ʌ"۔ فارسی اور عربی ترکیبیں زیادہ ہیں۔ سول اور ملٹری کے لیے اہل قلم اور اہل شمشیر یا شمشیربند کی اصطلاح مستعمل ہے۔ ذیل میں چند جملے درج کیے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ عربی اور فارسی ترکیبیں بکثرت استعمال کی گئی ہیں:—

"ان کی موت کی تفصیل ہنوز کماینبغی معلوم نہیں ہوئی"

"شاید کہ جنون زدہ ہوا ہو۔ لوگوں پر ہنوز کچھ حقیقت اس کی مکشوف نہیں ہوئی۔ گاڑی بانوں کے اہتمام و سعی سے یہ آتش فرو ہوئی"۔

ان کے علاوہ کہیں کہیں فارسی محاوروں کو اردو میں ڈھال لیا گیا ہے مثلاً "رو دادن" سے "رُو دینا" جیسے ذیل کے جملے سے واضح ہے:۔

"اگر ارباب حکومت اس کی کچھ تدبیر مناسب فرماویں تو خوب، نہیں تو ہمیشہ ایسے ہی اتفاقات رُو دیتے رہیں گے"۔

عبارت میں "نے" کا استعمال بالکل کم ہے، اگر کہیں اس کا استعمال کیا بھی گیا ہے تو غلط۔ مثلاً "امام نے اپنے یاروں کے ساتھ دعا اور استغفار میں مشغول تھا" یا "پراس نے عربوں کی تائید سے ان کے ہاتھ گرفتار نہ آسکا"۔

۱۸۴۹ ع میں اس کے علاوہ مدراس سے ایک اور اخبار «آفتاب عالمتاب» نکلتا تھا۔ اس کی خبروں کا حوالہ دھلی کے مشہور ریاضی داں ماسٹر رامچندر کے اخبار «فوائدالناظرین» میں پایا جاتا ھے[1]۔

مدراس کے ایک اور اخبار کا ذکر نواب غلام غوث خاں بہادر اعظم نے اپنے تذکرۂ گلزار اعظم میں کیا ھے۔ مولوی محمد مہدی واصف کے بیٹے حکیم عبدالباسط متخلص بہ عشق ایک ھفتہوار اخبار «تیسیرالاخبار» کے نام سے نکالتے تھے، حکیم صاحب عربی اور فارسی کے علاوہ اردو اور انگریزی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے، شعر و شاعری سے طبیعت کو لگاؤ تھا اور خان عالم خاں بہادر فاروق اصلاح سخن کیا کرتے تھے۔ نواب اعظم کے قول کے مطابق ان کے اخبار میں مختلف ممالک کے حالات و واقعات درج ھوا کرتے تھے۔ نواب صاحب نے یہ تذکرہ چونکہ ۱۲۶۹ ھ مطابق ۱۸۵۲ع میں مرتب فرمایا اس سے یہ اندازہ ھوسکتا ھے کہ یہ اخبار ۱۸۵۲ع سے کچھ پہلے ھی جاری ھوا ھوگا، بہت ممکن ھے کہ یہ زیادہ مدت تک زندہ نہ رھا ھو کیونکہ اس کے حوالے کسی اور اخبار میں نہیں پائے جاتے[1]۔

غدر سے کچھ دنوں پہلے شاید ۱۸۵۶ع میں محمد خواجہ بادشاہ صاحب عبرت نے ایک اخبار «مظہرالاخبار» کے نام سے جاری کیا، اس کا دفتر ترملکھڑی میں مسجد والا جاھی کے متصل تھا۔ عموماً یہ بارہ صفحات کا ھوتا تھا۔ د تاسی نے اس اخبار کا ذکر کیا ھے اور اس کو عشرہ وار کہا ھے[2] لیکن میرے پاس جو نمبر ۱۸۵۹ع کے موجود ھیں ان سے ظاھر ھوتا ھے کہ یہ ھفتہ وار اخبار تھا، بہت ممکن ھے کہ ابتدائے اشاعت میں یہ اخبار عشرہ وار رھا ھو، پہلے صفحہ پر ایک غزل مدحیہ اخبار کے متعلق ھوا کرتی تھی جس کا مطلع یہ ھے:

۱- رسالۂ اردو ماہۂ اپریل ۱۸۳۵ع صفحہ ۲۰۱ - تذکرہ گلزار اعظم صفحہ ۵۶۴ - تذکرہ نویس نے اخبار کے متعلق یہ تصریح نہیں کی کہ یہ اردو میں شایع ھوتا تھا لیکن میرا یہ قیاس شاید غلط نہیں کہ اس زمانے میں اردو اخبارات کی پسندیدگی عام کی وجہ سے جناب عشق نے اس کو اردو ھی میں جاری کیا ھوگا، صاحب تذکرۂ شعرائے دکن نے عشق کے ذکر میں اسی اخبار کا نام تمیزالاخبار بتایا ھے جو غالباً تصحیف ھے۔

۲- خطبات گارساں د تاسی ص ۵۱۹۔

«ضیائے دیدۂ بینا ہے مظہرالاخبار - مفید مردم ہر جا ہے مظہرالاخبار»

غزل کے بعد ایک مختصر سی نظم تھی جس میں اخبار کی تاریخہائے اشاعت وغیرہ کے متعلق مفصل معلومات درج ہوتی تھیں۔ ذیل میں اس کو درج کیا جاتا ہے :-

اطلاع در مثنوی

قلم اب مضامین رنگیں رقم کر　　خیال معانی نو یک قلم کر
تری قید تحریر میں ہیں مطالب　　لکھا کر وہی بات جو ہے مناسب
تکلف سے تمہید کی باز آ اب　　نہیں ناظرینوں کو ہے اس سے مطلب
یہ اخبارنامہ جو ہے خوب و زیبا　　ہمیشہ سہ‌شنبہ کو مطبوع ہوگا
پئے چہارشنبہ جمعرات دو روز　　شش و پنج اس میں نہیں اے دل‌افروز
سدا ڈاک پر روز آدینہ جاوے　　لفافے یہ زیب مواہیر پاوے
بلاعذر بھجوائے ہر صاحب زر　　جو ماہواری یک روپیہ ہے مقرر
اگر پیشگی سال کی ہووے درپیش　　روانہ کریں نو روپے بےکم و بیش
کسی پر گزر جائے گر سال پورا　　نہ لیویں روپیہ پندرہ سے کم اصلا
جو ہر هفته روئداد لکھا کریں گے　　ہم ان کو چپ اخبار بھیجا کریں گے
مگر ڈاک کی ان کے جانب ہو اجرت　　یہ آئین جاری رکھیں اہل خبرت
جو کوئی چھاپنے بھیجے نظم و عبارت　　تو فی سطر چار آنے پہنچا دے اجرت
یہی مدعا مشتہر کا ہے هر آں　　رہیں ناظریں شاد و خورسند وفرحاں

زیر نظر نمبر، ۱۳ ذیقعدہ ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۴ جون ۱۸۵۹ء کا ہے۔ دوسرے صفحہ پر ایڈیٹوریل کے سلسلے میں ذیل کا مضمون ہے جو اس زمانے کی عبارت کا ایک اچھا نمونہ ہے :-

مدراس ہمایوں اساس

«بفضلہ اس هفتے کے ایام ٹھنڈے ٹھنڈے ہی گزرے، نوع غلبۂ حرارت کاستہ نظر آیا، کچھ ابر بھی گھٹا کیا۔ بہ فیض ترشح دو راستہ چھنکاؤ ہوا۔ سرسبزی دکھلائی دی۔ تقاطر آب پئے اطفال نباتات کو جو مہد زمیں پر بہ کمال تشنہ‌لبی مضطرب‌الحال تھے

سیرابی بخشی، غرض ماجرائے شب کا یہ اثر ہے روداد روز نوع دیگر ہے۔ چہرۂ آفتاب ہنوز بےنقاب ہے، شدت تپ و تاب سے مہر واحد بےتاب ہے، طائر حواس بر ہوا ہے۔ آشیانۂ جمعیت عنقا ہے۔ نظارۂ باغ و بہار پر ہر بلبل دل بلہار ہے، جدھر دیکھیے ادھر پھولوں کا مہکار ہے، علی‌الخصوص موگرے کی ارزانی موبمو افزائش پذیر ہے۔ بےقدری عطر موتیا سے عطار دلگیر ہے۔ ہر سو سیر و تماشا ہے، ہوائے صحن چمن دلکشا ہے، برسرروڈ دوطرفہ آم کے بنڈیوں کی قطار ہے۔ انبہ فروشوں کی پیدائش روزمرہ روبکار ہے۔ ذائقہ چشی و پسند خاص و عام ہے۔ کثرت انبہ سے قدر دوکان حلوائی قلت سرانجام ہے، کہتے ہیں کہ آج کل پھر برنج کی گرانی نمودار ہونے سے موبمو ہجوم رنج و افکار عاید حال غربا ہے۔ دانۂ گندم کی طرح دل ہر آدم زاد دو نیم بنا ہے۔ رزاق مطلق جلد اپنے فضل و کرم کی نمائش دکھلاوے، بندگان پریشان روزگار کو بہ سرعت تمام راہ راست روزینہ پر لاوے»۔

اس قسم کی عبارت صفحہ ادارت کے مضامین کے لیے ہی مخصوص نہیں، کہیں کہیں معمولی چیزوں میں بھی اس رنگینی کی جھلک ہے، غالباً یہ ایڈیٹر صاحب کے شاعرانہ ذوق و شوق کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ «نیلام املاک کرناٹک» کے تحت میں لکھتے ہیں:—

«ناظرین کو یاد ہوگا کہ دو ہفتوں کے آگے جو نیلام املاک کرناٹک دیا گیا اور من بعد اس کے ظہور میں چندے وقفہ پائے جانے سے لفظ موقوفی قید قلم ہوا سو اس کا اصل حال آج کھلا۔ پردۂ توقف یک قلم درمیان سے اٹھا۔ چنانچہ بہ‌معرفت رسیور صاحب تمامی اسباب مابقی کرناٹکی از جز تا کل نیلام ہوگیا۔ تخت طلائی کا ایک تختہ بھی سونے کے لیے باقی نہ رہا۔ سڑی (سیڑھی) کی خواہش اس قدر کرسی نشین دل خریدارائی ہوئی کہ فوراً اس رشک چارپائی فلک کی اشترا نمایاں ہوئی۔ پارچہ‌جات و کتب وغیرہ ارزاں تر دست بدست تھے۔ کاروبار گرانی بے بندوبست تھے۔ غرض مشتریان زہرہ طالع نے خاطر خواہ نقد مدعا ہاتھ کیا۔ گو ہر متاع مقصود سے جیب آرزو بھرلیا»۔

عبارت میں فارسی اور عربی ترکیبوں کی بھرمار ہے اور جابجا «نے» کا صحیح استعمال پایا جاتا ہے۔ خبریں اکثر انگریزی اخبارات سے نقل کی گئی ہیں۔

فورٹ سینٹ جارج گزٹ کے بعض اہم اعلان بھی درج کیے گئے ہیں، خبریں ہندستان کے مختلف شہروں سے تعلق رکھتی ہیں ، زیر نظر نمبر میں غدر کے بعد کے حالات ہیں ، « تانتیا ٹوپی » اور فیروز شاہ کی فراری اور ان کی تلاش کا ذکر پایا جاتا ہے۔
غدر دھلی کے زمانے میں مدراس میں فارسی اور اردو شعر و شاعری کا بہت چرچا تھا نواب اعظم کے مشاعروں کی بدولت بہت سے ارباب سخن شہر میں جمع ہوگئے تھے اور یہاں ایک علمی فضا پائی جاتی تھی ۔ اس کا اندازہ ان متعدد اخبارات اور مطابع سے ہوتا ہے جو اس زمانے میں یہاں روز افزوں ترقی پر تھے ۔ غدر کے بعد ہی شاہ محمد صادق صاحب شریف مدراسی نے مطبع شریفیہ جاری کیا اور اس مطبع میں ان کے زیر سرپرستی ۱۸۵۹ع میں اخبار صبح جاری ہوا ۔گارساں دتاسی نے اپنے پندرھویں خطبہ مورخہ ۱۸۶۵ع میں اس اخبار کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا :۔ «مدراس سے اردو کا اخبار صبح صادق برابر شایع ہورہا ہے۔ یہ ھفتہ وار ہے اور ہر سہ شنبہ کو شایع ہوتا ہے ۔ یہ بڑی تقطیع پر ہوتا ہے اور ہرصفحہ پر دوکالم ہوتے ہیں ۔اس کے مدیر عبدالرحمن شفاف ہیں۔ اس کی متعدد اشاعتیں میری نظر سے گزری ہیں ۔ ان میں سے ایک میں ہندؤوں کی غیر اخلاقی اور وحشیانہ رسوم پر تنقید ہے ۔ ان رسموں میں سے۔ایک « چرک پوجا » ہے۔ جس طرح ستی کی رسم کو خلاف قانون قرار دیا گیا ہے ، اسی طرح اس کو بھی خلاف قانون قرار دینا چاہیے ۔ اس مضمون میں بعض ہندو فقیروں اور مالابار کی برھنہ عورتوں کے حالات درج ہیں ۔ اس رسم کو شاستروں کی تعلیم کے خلاف بتایا گیا ہے ۔ ہندو عورتوں کو اگر بالکل نو عمری میں بیاہ نہ دیا جائے تو وہ عمر بھر بن بیاہی رہتی ہیں اور ان کو دیوتاؤں کی نذر کردیا جاتا ہے ۔ یہ سب عورتیں فحش میں مبتلا ہوتی ہیں ۔ اسی اخبار میں سیفی کا ایک مضمون نظر سے گزرا ، یہ اچھا خاصا لکھ لیتے ہیں ۔ یہ مضمون امام حسن اور امام حسین کی شہادت کے متعلق تھا ۔ اس کے علاوہ غالب کی ایک غزل اس میں درج تھی جس کی ردیف پاؤں ہے ۔ مدیر نے مسٹر پامر کے ان مضامین پر تبصرہ لکھا ہے جو موصوف نے اودھ اخبار اور اجنا عالم کے لیے لکھے تھے ، تبصرے میں مسٹر پامر کے طرز انشا کی تعریف کی گئی ہے اور

اس خواهش کا اظهار کیا هے که اچها هو که اگر گورنمنٹ ایسے یورپینوں کو مدارس کے سررشته تعلیم میں اعلیٰ خدمات پر مقرر کرے تاکه ان سے نفع حاصل کیا جاسکے۔ ایسے اشخاص کا اثر مدارس پر بهت مفید هوگا ، اس لیے که وه هندستانی ، عربی اور فارسی سے بهی واقفیت رکهتے هیں» ۔ گارساں د تاسی نے ۱۸۶۶ ع کے خطبه میں دوباره اسی اخبار کا ذکر کرتے هوئے لکها هے :— « ......که یه اخبار مهینے میں تین بار شایع هوتا هے اور باره صفحات پر مشتمل هوتا هے۔ کبهی کبهی اس کے ساتھ ایک ضمیمه بهی هوتا هے جس میں ادبی مضامین هوتے هیں۔ اس کی صفائی عمده قسم کی هے۔ سر ورق پر جهاں اخبار کا نام هوتا هے اس کے چاروں طرف سرخ رنگ کے بیل بوٹے بنے هوتے هیں ۔ ان گل بوٹوں کے اندر چار اشعار لکهے هوتے هیں جن میں اس اخبار کی نوعیت اور مقصد کو بتایا گیا هے[1] »۔

شریف صاحب[2] کی سرپرستی میں ایک اور اخبار طلسم حیرت (مدراس پنچ) جاری هوا ۔ اس کے اجرا کی تاریخ به قول مصنف اختر شاهنشاهی (سوانح عمری اخبارات) ۱۸۵۹ ع هے ۔ لیکن میرے پاس جو اجزا اس اخبار کے هیں وه ۱۹۰۶ ع کے هیں اور ان سے یه ثابت هوتا هے که یه چهپنویں جلد کے اجزا هیں اور اگر عام طریقه کے مطابق هر سال کی ایک جلد قرار دی جائے تو تاریخ اجرا غالباً ۱۸۵۰ ع هوگی ۔ بهر حال اس امر میں قطعی فیصله ذرا مشکل هے ۔ یه اخبار شاه محمد صادق صاحب کے فرزند جناب غلام محی الدین صاحب حنیف کی ایڈیٹری میں نکلتا تها ۔ شریف صاحب کے دوسرے فرزند جعفر حسین صاحب حریف اس کے مهتمم تهے۔ عشره وار اخبار تها اور آٹھ صفحوں پر شائع هوا کرتا تها ۔ باوجود تلاش کے اس اخبار کے وه نمبر جو انیسویں صدی میں شایع هوئے ، دستیاب نه هوسکے ۔ ۱۹۰۶ ع کی اشاعتوں پر قیاس کرنا اور ان کا انتخاب دینا میں اس لیے

۱۔ گارساں د تاسی نے اسی سلسله میں مدراس کے ایک اور اخبار مسمی به ریاض الاخبار کا ذکر بهی کیا هے ۔ ۲ ۔ شریف صاحب مدراس کے ممتاز شاعروں میں سمجهے جاتے تهے - ان کے تلامذه کا حلقه خاصا وسیع تها ۔ ان کے شاگردوں میں جناب شاه عبدالقدوس صاحب ضوء صاحب دیوان هیں اور بحمدالله اب تک بقید حیات هیں ۔

غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ میرے عنوان مضمون سے خارج ہے ۔ بہر حال یہ ان گنتی کے دو ایک اخباروں میں ہے جن کی مدت اشاعت تقریباً ساٹھ سال کے لگ بھگ رہی ۔ غالباً اس وصف میں مدراس کا ایک اور اخبار 'طلسم حیرت' پر سبقت لے جاتا ہے اور وہ "شمس الاخبار" ہے ۔ یہ ۱۸۵۹ ع میں جاری ہوا ' پہلے پہل یہ چھوٹی تقطیع پر شایع ہوتا رہا لیکن بعد میں یہ بڑی تقطیع پر شایع ہونے لگا ۔ بمبئی ٹائمز اور اسٹیٹسمین کی تقطیع سے کچھ بڑی تقطیع کے چار بڑے صفحات پر ہفتہوار شایع ہوتا تھا ۔ ابتدائے اشاعت میں یہ عشرہوار تھا لیکن کچھ دنوں کے بعد ہفتہوار ہوگیا ۔ ۵ ستمبر ۱۸۷۳ ع کی اشاعت سے یہاں ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے تاکہ یہ اندازہ ہوجائے کہ اس زمانے میں مدراس کے اخبارات نہایت صاف اردو میں شایع ہوا کرتے تھے :- "چونکہ ۱۵ اکتوبر آئندہ میں مسٹر اربتھ نٹ صاحب رکن اعظم کونسل گورنمنٹ مدراس ولایت کی طرف کوچ فرمانے والے ہیں لہذا یہ یقین آتا ہے کہ ان کی خدمت دویم گورنری پر مسٹر الس صاحب مامور یا رابن سن صاحب مقرر ہوں ۔ سننے میں آیا ہے رابن سن صاحب صدر جو فی الحال مقیم ولایت ہیں عطائے خدمت بالا مذکور میں وہاں نہایت سعی و کوشش کررہے ہیں مگر بہ نظر اس بات کے کہ الس صاحب صدرالوصف کے اس ملک میں بہت دوستدار ہیں کچھ بڑی بات نہیں کہ خدمت مذکور کے وہی صاحب مستحق ٹھیریں اور مامور ہوجائیں ۔ غرض دونوں صاحب بھی اچھے عقیل اور تجربہکار ہیں اور اس عہدہ کے لایق اور سزاوار ہیں ۔ دیکھنا ہے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنا ہے "۔

اس اخبار کی عنان ادارت مدراس کے ایک مشہور علمی خاندان کے ایک ممتاز فرد کے ہاتھ میں تھی ۔ اس کے پہلے ایڈیٹر سید عبدالستار صاحب سنین تھے ' یہ شاہ محمد عزیزالدین صاحب کھٹالہ دید ' فرزند غلام مرتضیٰ کھٹالہ کے سالے تھے ۔ غلام مرتضیٰ کھٹالہ کے پردادا نواب سعادت اللہ خان بہادر کے عہد حکومت میں ارکاٹ (محمد پور) میں مقیم ہوگئے تھے ۔ ان کے والد بڑے صاحب کھٹالے خاندان والا جاہی کے متوسلین میں سے تھے ۔ ارکاٹ کے مدارس و مکاتب کے داروغہ کی حیثیت سے انھیں ماہوار

ایک سو پانچ روپیہ کا وظیفہ دیا جاتا تھا ۔ بڑے صاحب کھٹالے کا علمی فوق اس امر سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اس زمانے میں چند رسائل علم ہیئت میں ترجمہ کیے تھے جن میں سے رسالہ مختصر دقائق النجوم ۱۸۴۸ع میں مدراس میں طبع ہوا۔ بڑے صاحب کھٹالے کے بعد ان کے فرزند غلام مرتضیٰ کھٹالہ بھی « داروغہ مدارس اطفال مساکین » کے عہدے پر مامور رہے ۔ ان کے فرزند شاہ عزیزالدین صاحب نواب اعظم کے مشاعرے کے ممتاز اراکین میں سے تھے ۔ یہ ایک صوفی منش بزرگ تھے ۔ علوم عربیہ و فارسیہ کے علاوہ اردو، تلنگی، ٹامل اور انگریزی میں بھی خاصی مہارت تھی۔ فارسی دیوان، اردو مثنوی اور متعدد رسائل علم نجوم، عروض و قافیہ و تصوف وغیرہ میں ان کی تصانیف کئی ہیں ۔ آخر زمانے میں انھوں نے اس امر پر زور دینا شروع کیا کہ نماز میں صرف قرآن کا اردو ترجمہ پڑھا جائے تو کافی ہے اور اس سلسلہ میں بعضے پاروں کا اردو میں ترجمہ کیا ۔ شاہ عزیزالدین صاحب کی یہ تحریک اس قدر جدید اور انوکھی تھی کہ ارکاٹ اور ویلور کے علما و مشائخین ان سے بدظن ہوگئے اور انھیں عوام کے ہاتھوں سخت تکلیفیں اٹھانی پڑیں ۔ اس خاندان کے افراد کی علم دوستی اور اردو پروری کی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں اور سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ اس خاندان کے افراد کے مساعی کی بدولت مدراس میں اردو صحافت کو کافی ترقی نصیب ہوئی ۔

سید عبدالستار صاحب سنین کے زیر اہتمام شمس الاخبار نہایت کامیابی سے نکلتا رہا۔ کچھ مدت کے بعد اس اخبار کی ادارت شاہ محمد عزیز الدین صاحب کھٹالہ کے فرزند محمد نصیرالدین کھٹالہ کے سپرد ہوئی۔ یہ بھی عربی فارسی کے قابل عالم تھے اور ان کے مددگار کارکنوں میں بھی عربی اور فارسی جاننے والوں کی ایک خاصی جماعت تھی۔ اسی وجہ سے اس اخبار میں عربی فارسی اور ترکی اخبارات سے بہت سی خبریں ترجمہ کرکے شائع کی جاتی تھیں ۔ پندرہ بیس سال کے عرصہ میں اس اخبار کی شہرت، ہندستان سے نکل کر بیرون ہند تک پہنچ گئی ۔ ۱۸۷۸ ع میں جنگ روم و روس کے زمانے میں اس اخبار نے حکومت ترکیہ کی امداد کی ترغیب دلائی اور اسی اخبار کی ترغیب و تحریص پر ہندستان کے ہر گوشے سے ہزارہا روپیہ چندہ فراہم

ہوا اور اسی کے مطبع کے ذریعہ سے سلطنت عثمانیہ کی خدمت میں روانہ کیا گیا اور اسی خدمت کے سلسلے میں سلطان عبدالحمید خاں ثانی نے تمغۂ مجیدیہ مرحمت فرمایا۔ اخبار کے لیے یہ اعزاز باعث فخر و ناز تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد سے شمس الاخبار کے سرورق پر ہمیشہ شکل تمغۂ مجیدیہ ہوا کرتی تھی۔ مدراس کا بلکہ شاید هندستان کا یہ سب سے کثیر الاشاعت اخبار تھا اور آج بھی جب کہ اخبار کو بند ہوئے ایک عرصہ گزرا ہے، جام بازار مدراس میں اس کے دفتر کی عمارت شمس الاخبار ہی کے نام سے مشہور ہے۔

۱۸۶۰ع کے قبل ان کے علاوہ اور چند اخبار جاری ہوئے۔ ان میں سے بعض کے نام گارساں د تاسی نے اپنے خطبات میں گنائے ہیں لیکن یہ شاید بہت دنوں تک جاری نہ رہ سکے[1]۔ ۱۸۶۱ع سے ۱۸۷۰ع تک کا زمانہ مدراس میں اردو اخبارات کے عروج کا زمانہ ہے۔ پرانے اخبارات نے اپنے حجم، طباعت اور اشاعت میں خاصی ترقی کی اور کئی ایک جدید اخبارات جاری ہوئے۔ ان اخبارات کی فہرست پر نظر کرنے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ اس صوبے میں ان متعدد اخبارات کی نکاسی کس طرح ہوا کرتی تھی۔ اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ بعض اخبارات کی زندگی نہایت ہی مختصر تھی لیکن باوجود اس کے اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر نئے اخبار کے خیر مقدم کے لیے شائقین کی ایک کثیر تعداد تھی۔

۱۸۶۲ع میں شاہی عمدۃ الاخبار جاری ہوا۔ یہ مہینے میں تین بار اور چھ بار چھپتا تھا۔ سر ورق مصور ہوا کرتا تھا۔ آدھے صفحہ پر حویلی کارخانۂ اخبار اور مطبع انوری کا نقشہ ہوا کرتا تھا اور بقیہ آدھے صفحہ پر جدول میں مدراس کے درباری امیر، نقیب، یا فوجی عہدہ‌داروں کی تصویریں لیتھو میں چھپا کرتی تھیں۔ سر ورق کے نچلے حصہ میں اخبار کا نام اور اس کے نیچے یہ قطعہ درج ہوا کرتا تھا:-

ہر ایک کام میں عمدہ ہے عمدۃ الاخبار تمام وصف میں یکا ہے عمدۃ الاخبار
عجب ہے کیا جو ہو مقبول عمدگان جہاں کہ نام نامی تو اس کا ہے عمدۃ الاخبار

[1] د تاسی نے اپنے خطبۂ مورخہ ۴ دسمبر ۱۸۵۴ع میں مدراس کے اخبارات کے ذیل میں مرآۃ الاخبار اور قاصد مدراس کے نام دیے ہیں۔

اس کے دھنے جانب قیمت اخبار کی تفصیل اور بائیں جانب هالوے صاحب کے مرهم کا اشتہار مصور ہوا کرتا تھا ۔ آخری صفحه پر بھی عمارت دفتر اخبار کا نقشه اور هالوے کے حبوب اور روغن کے باتصویر اشتہار ہوتے تھے ۔ گارساں د تاسی نے اس اخبار کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں کبھی کبھی تصویریں بھی شائع ہوا کرتی ہیں ۔ مدراس جام بازار کوچۂ فقیر صاحب میں مطبع انوری میں یه پہلے پہل طبع ہوتا تھا اور علی العموم اس کی کتابت محمد جمال الدین اعجاز کیا کرتے تھے ۔ کچھ مدت کے بعد یه مطبع اکبری میں زیر اهتمام محمد اکبر صاحب طبع ہونے لگا اور اس زمانے میں یه مہینے میں تین بار چھپنے لگا ۔ ذیل کی عبارت اخبار مورخه ۲۰ نومبر ۱۸۷۵ ع سے منقول ہے :-

« مدراس مسرت اساس ۔ اگرچه که موسم باران مانند تابستان کے گزرگیا لیکن اس عشرے کے آغاز سے کچھ بوندا باندی شروع ہوئی ہے ۔ تیرھویں کی شب کو تھوڑے وقت تک اچھی بارش ہوئی اور رعد اور برق نے اپنی گرمیاں دکھلائے اور دریا کے پل پر صاعقه گرا اور ایک ستون چوبی کو جو کہ روشنی کرنے کے لیے استادہ کیا گیا تھا ضائع کیا ۔ کہتے ہیں کہ ایک پہرے والا اس وقت وھاں ایک چھپرے میں سورھا تھا اس کے اوپر صاعقه گرا سو مقام کے درمیان فقط ۵ گز کا فاصله تھا لیکن خالق حقیقی کے کرم و فضل سے اس کو کچھ مضرت نه ہوئی اور اس کو صاعقه کا آسیب نه پہنچا ۔ اور ایک نادر تماشا یه دیکھنے میں آیا کہ دوپہر شب کے قریب لائٹ ہوز کے جنوب طرف واقع ہے سو میدان میں ایک کرۂ نوری جو کہ دو یا تین قدم کا مدوّر ہوگا آسمان پر سے اترتا ہوا نظر آیا اور آڑھا تیڑھا بجلی کی سرعت کے مانند دریا طرف گیا ۔ اس کے رنگ بو قلموں تھے یعنی نیلگوں اور بنفشائی مگر رنگ بنفشائی کو غلبه تھا ۔ غرض کرۂ مذکور گم ہونے کے پیشتر پھوٹ گیا اور اس کے ناهموار ٹکڑے ہوگئے مگر ہر ایک ٹکڑا منور و مجلا تھا اور رومی چراغ کے مانند رنگ بدلتا تھا بعد ازیں وہ سب کے سب گم ہوگئے ' بہت سے دیسی لوگ اس عجیب و غریب تماشے کو دیکھ کر بہت گھبرائے » ۔

عبارت میں گو تک بندی مفقود ہے لیکن عربی اور فارسی الفاظ اور ترکیبوں کا

استعمال برابر جاری ہے۔ ہند اور بیرون ہند کی کیفیتیں اس میں طبع ہوا کرتی تھیں اور جتنے نمبر نظر سے گزرے ہیں ان سے پتا لگتا ہے کہ ایڈیٹوریل کا کوئی خاص اہتمام نہیں تھا۔ مختلف جزوں کے ساتھ مدیر اخبار کی رائے بھی بسا اوقات شامل کردی جاتی تھی۔

اسی زمانہ میں بنگلور سے منشی محمد قاسم صاحب غمؔ کی زیر ادارت «قاسم الاخبار» جاری ہوا۔ کیا بہ لحاظ طباعت اور کیا بہ لحاظ مضامین یہ اخبار اپنی آپ نظیر تھا۔ اخبار کے سرورق پر فارسی کا یہ قطعہ درج ہوا کرتا تھا:—

قاسم الاخبار اخباریست بے مثل و شگرف بر صحائف می زند لاف از کمال برتری
بے سر اغراق سال ھجریش بنوشت عیش جام جمشید است یا آئینۂ اسکندری

مصرعۂ تاریخ کے لحاظ سے ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۵ع گویا اس کی تاریخ ابتدا ہے۔ منشی محمد قاسم صاحب بنگلور کے ممتاز شعرا میں سمجھے جاتے تھے۔ ان کی وجہ سے ایک زمانہ تک شعر و شاعری کا چرچا رہا۔ ان کے احباب و تلامذہ کی خاصی تعداد تھی اور شہر کے مشاعروں کی ان کی وجہ سے گرم بازاری تھی۔ آج کل بھی ان کے اشعار بنگلوری حضرات کے زبان زد ہیں۔

یہ ہفتہ وار اخبار بڑی تقطیع کے آٹھ صفحوں پر شائع ہوتا تھا۔ ہر صفحہ میں تین کالم ہوتے تھے اور ہر کالم میں تیس بتیس سطریں ہوا کرتی تھیں۔ بسا اوقات «منقولات» کے ذیل میں اردو رسائل اور اخبارات سے مفید اور علمی مضامین نقل کیے جاتے تھے۔ زیر نظر پرچہ ۲ اگست ۱۸۷۵ع کا ہے۔ اس میں ایک مضمون سائنٹفک سوسائٹی سے نقل کیا گیا ہے جس کا عنوان یہ ہے «بالفعل ہندستان میں پارلیمنٹ کا ہونا ہرگز مناسب نہیں»۔ اس اخبار میں ایڈیٹوریل خاص اہتمام سے لکھا جاتا تھا۔ ذیل کے اقتباسات ایک ایڈیٹوریل سے ماخوذ ہیں جن کا عنوان «صنعت و حرفت» ہے:—

«اگرچہ کہ ہم نے بارہا اس مہمات معاملہ پر بحث کئے لیکن اس کا کچھ فائدہ ظاہر نہ ہوا نہ سرکار والے عام و خاص کے لیے مدارس دستکاری اجرا کیے اور نہ رعایا تجارت کرنے اور ہنر سیکھنے میں مشغول ہوئے جس سے دو بات ہمارے خیال میں آتے

ہیں - پہلی یہ کہ ہماری بات کوئی سننے والا نہیں بلکہ ہماری تحریر لوگوں کے لیے فسانۂ عجائب اور چہار درویش کے مقابلہ میں ہے دوسری یہ کہ ہندستان سے ابھی ادبازی نہیں گئی ہے اور نہ لوگوں کو آرام و راحت سے ایام گزارنے کا موقعہ ملا .....“

اس طویل مضمون میں صنعت و حرفت اور تجارت کے فوائد پر بحث کی گئی ہے اور مسلمانوں کو ترغیب دلائی گئی ہے کہ وہ دستکاری کی طرف متوجہ ہوں - اس میں انگریزی تعلیم یافتہ ہندستانیوں کی بیکاری کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے : ذیل کے بعض جملے آج کل حیرت کی نظر سے دیکھے جائیں گے کہ آج سے پینسٹھ سال پیشتر بھی تعلیم یافتہ بیکاروں کی تعداد روز افزوں ترقی پر تھی :-

”......چونکہ روز بروز انگریزی مدرسے ہی اجرا ہوتے ہیں اس لیے لوگوں کو گمان ہوتا ہے کہ سرکار کا ارادہ ہم سب کو زبان انگریزی میں تعلیم کرکے سرکاری خدمتیں دینے کا ہے - اس خیال سے خاص و عام انگریزی پڑھنا شروع کرتے ہیں - پھر ہنر سیکھنے سے باز رہتے ہیں - جب کہ انگریزی پڑھنے میں ان کے اوقات صرف ہوتے ہیں ، ہنر نہیں سیکھتے - پھر جب کہ سرکاری خدمتیں ان کو نہیں ملتیں ہیں غریب اور مفلس ہوجاتے ہیں.........ہم کو یاد ہے کہ چند روز پیشتر ایک افسر صاحب کہتے تھے کہ ان دنوں انگریزی پڑھے ہوئے لوگ جس آسانی سے کہ ملتے ہیں گھوڑے کا کام کرنے کے لیے اس آسانی سے سائیس نہیں ملتے - جب کہ ابھی یہ حالت ہے تو آئندہ کیا ہوگی....“ منقولات اور ایڈیٹوریل کے علاوہ نامہ نگاروں کے مضامین اور خطوط بھی درج اخبار ہوتے تھے اور مختصر خبریں ہند و بیرون ہند کی انگریزی اخبارات سے ترجمہ کرکے شائع کی جاتی تھیں -

۱۸۶۵ ع میں ایک اور اخبار ”اخبار کرتاں“ کے نام سے نکلنے لگا - اس کے سرپرست کابل پٹن کے ایک مشہور تاجر ”کرتان حاجی محمد قاسم“ صاحب تھے - محمد قاسم صاحب اس علاقے کے رہنے والے تھے جہاں کے مسلمانوں کی مادری زبان ٹامل ہے - یہ مدراس جب آئے تو سب سے پہلے انھوں نے چرم کی تجارت شروع کی اور دباغت کے مختلف کارخانے مدراس ، ویلور ، بنگلور ، سکندرآباد اور حیدرآباد میں قائم کیے -

مدراسی مسلمانوں میں یہ سب سے پہلے تاجر چرم تھے جنھوں نے یورپ اور امریکہ سے تجارت شروع کی ۔ اپنے قیام مدراس کے زمانے میں انھوں نے ایک اردو داں دکھنی خاتون سے شادی کی اور غالباً اسی اثر کا نتیجہ تھا کہ اردو مصنفین اور شعرا کی انھوں نے سرپرستی کی ۔ ان کے ایما پر عبداللہ مشاق نے بوستان سعدی کا ترجمہ اردو اشعار میں بحر متقارب میں کیا اور "بہارستان کرتاں" کے نام سے یہ کتاب ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۴ع میں ویلور کے مطبع مسلمانی میں طبع ہوکر شائع ہوئی ۔ اس کے ہر نسخے پر کرتاں محمد قاسم صاحب کی مہر موجود ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ جملہ بھی درج ہے :— "ہر کتابیکہ از مہر کرتاں محمد قاسم صاحب مفروق است مسروق است" ۔ دتاسی[۱] نے بھی اخبار کرتاں کا ذکر کیا ہے اور اس کو مدراس سے منسوب کیا ہے اور اس کو عشرہ وار چھوٹی تقطیع کا اخبار بتایا ہے ۔ اختر شاھنشاھی میں اخبار طلسم کرتاں کا ذکر ہے اور اس کو بنگلور کا ہفتہ وار اخبار بتایا گیا ہے ۔ اس کتاب سے یہ پتہ لگتا ہے کہ یہ اوسط تقطیع کا تھا اور مطبع نبوی سے شائع ہوا کرتا تھا ۔ اخبار کے نام میں اختلاف سے یہ شبہہ ہوتا ہے کہ شاید دو اخبار مدراس اور بنگلور سے بہ یک وقت حاجی محمد قاسم صاحب کی امداد سے نکلتے تھے اور یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے اس لیے کہ حیدرآباد اور بمبئی میں بھی حاجی صاحب کی تجارتی کوٹھیاں تھیں اور انھوں نے وہاں مطابع قائم کیے تھے ۔ بمبئی سے متین کرتاں اور حیدرآباد سے شوکت اسلام غالباً ۱۸۸۰ع کے بعد ان کی سرپرستی میں جاری تھے ۔

اب تک جن اخبارات کا ہم نے ذکر کیا ہے ان میں سے اکثر ۱۸۷۰ع کے بعد بھی جاری رہے ۔ غالباً اعظم الاخبار کچھ مدت پہلے ہی بند ہوچکا تھا کیوں کہ غدر سے بعد کے اخبارات میں اس کے حوالے نظر نہیں آتے ۔ جن اخبارات کے اقتباسات ہم نے اس سے قبل پیش کیے ہیں وہ ان اشاعتوں سے لیے گئے ہیں جو ۱۸۷۰ع کے بعد شائع ہوئے ۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ اخبارات اپنی تاریخ اجرا کے بعد

۱ ۔ خطبات گارساں دتاسی ص ۵۱۸ ۔

سے ایک طویل عرصہ تک جاری رہے۔ ۱۸۷۰ء سے ۱۸۸۰ء تک دس سال کے عرصہ میں اور آٹھ دس اخبار مدراس اور بنگلور سے شائع ہونے لگے۔ ۱۸۷۱ء میں ایک اخبار چھوٹی تقطیع کے آٹھ صفحات کا بنام "یادگار زمانہ" نکلنے لگا۔ یہ غالباً مہینے میں ایک دفعہ شائع ہوتا تھا۔ اس کے ہر صفحہ میں تین کالم ہوتے تھے، نہایت مختصر خبریں، مختلف اخبارات سے ملخص کرکے اس میں شائع کی جاتی تھیں۔ اس کی صرف ایک اشاعت نمبر ۹ جلد اول مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۸۷۱ء کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ذیل کے اخبارات سے خبریں لی گئی ہیں :-

"مفصلیٹ۔ انڈین پبلک اوپی نین۔ لکھنؤ ٹائمس۔ پائنیر۔ دھلی گزٹ۔ مدراس اتھینیم۔ اکسلسیر۔ ٹائمس۔ ایوننگ میل۔ انڈین ابزرور، شاھی عمدۃالاخبار"۔ خبریں نہایت مختصر ہوا کرتی تھیں اور بسا اوقات ان پر دو چار سطروں میں تبصرے بھی ہوتے تھے جیسے ذیل کے اقتباس سے واضح ہوگا :-

"تخفیف، گورنمنٹ انڈیا نے مشتہر کیا ہے کہ یکم سپٹمبر سے وہ قانون منسوخ کیا جائےگا جس سے ملازمان سرکار کو ھنگام تخفیف ھرجہ ملتا ھے۔ قانون مذکور اب اس طرح پر ترمیم ہوا ہے کہ جو شخص سپٹمبر سنہ حال سے تخفیف میں دےگا اس کو ھرجہ نہ ملےگا فقط۔ راقم لارڈ میو صاحب نے یہ ایک اور تخفیف نکالی لیکن یہ بات جزرسی میں شمار ہے کہ بیچارے ملازمان سرکار جو تخفیف کی وجہ سے زاید روپیہ بطور انعام یا ھرجہ کے پاتے تھے تو اپنے فقدان ملازمت کا غم بھول جاتے تھے۔ اب اس حکم سے ان کی دل‌شکنی ہوگی۔ بیچارے غریبوں کی تباھی ہوگی"۔

یہ اخبار محلۂ جام بازار کوچہ فقیر صاحب میں زیر اہتمام منشی محمد عبدالرزاق صاحب شائع ہوتا تھا۔ اس کے کاتب بھی محمد جمال‌الدین صاحب اعجاز تھے۔

اردو اخبارات کی کثرت اشاعت اور ان کی مقبولیت کا اثر صرف مدراس ھی تک محدود نہ تھا، بنگلور میں بھی قاسم‌الاخبار اور اخبار طلسم کرتاں وغیرہ کی ھر دل‌عزیزی سے بعض قابل حضرات کی توجہ اس جانب مبذول ہوتی جارھی تھی۔ چنانچہ ۱۸۷۳ء میں بنگلور سے «میسور اخبار» نامی ایک اور ھفتہوار اخبار «قاسم‌الاخبار» کی تقلید میں

جاری ہوا ۔ بہ لحاظ خوبیٔ طباعت و مضامین یہ بھی کسی صورت میں اپنے پیشرو سے کم نہ تھا ۔ حافظ سید محمد صاحب مالک مطبع فردوسی اس کے مہتمم تھے ۔ یہ پنجشنبہ کے روز بہ وقت شام پابندی کے ساتھ شایع ہوتا تھا ۔ قاسم الاخبار کے مقابلہ میں یہ اخبار سستا بھی تھا کیوں کہ اس کا چندہ عام شائقین سے سالانہ نو روپیہ تھا اور اس کا صرف چھے روپیہ ۔ معلومات اور خبروں کے لحاظ سے بھی اس میں کافی دلچسپی پیدا کی گئی تھی اور تحریر میں بھی روانی اور سلاست موجود تھی ۔

میسور اخبار جلد ۲ نمبر ۴۱ مورخہ ۷ جنوری ۱۸۷۵ع میں بنگلور کے لال باغ پر ایک طویل مضمون ہے جس کے بعض حصے یہاں درج کیے جاتے ہیں :—

" یہ باغ چھاؤنی بنگلور سے کچھ کم تین میل کے فاصلے پر جانب جنوب واقع ہے ۔ آوان سلطنت سلطانی میں اس کی بنا ڈالی گئی اور اقسام کے میووں کے درخت اس میں لگائے گئے تھے ۔ جب سرکار انگریزی نے اس ملک کو فتح کیا تو چند سال تک لال باغ اپنی قدیم حالت پر رہا ، عہد کمشنری سرمارک کبن صاحب میں لال باغ کی اور حالت ہوگئی ، میووں کے درختوں کو کاٹ کر بجائے ان کے مختلف قسم کے پھولوں کے درخت بوئے گئے ...... " ۔

اس کے بعد بورنگ صاحب کے عہد کی ترمیم کا ذکر ہے :— " طرح طرح کے پھولوں کے درخت ولائتی و دیسی لگائے ، بین بجانے کے لیے ایک نہایت خوشنما گھر تعمیر کرایا ، صاحبان انگریز اور ان کی لیڈیوں کی سیر اور ٹہلنے کے لیے ناف باغ میں ایک چبوترہ جس کے دو رویہ خوشنما سڑکیں اور پھولوں کے تختے نظر آتے ہیں ، تیار کیا گیا ۔ علاوہ اس کے لال باغ کے ایک گوشے میں شیر و شرزہ مختلف قسم کے چرند و پرند رکھے گئے ۔ غرض صاحب محتشم الیہ نے عہد حکومت میں لال باغ کو ایسا آراستہ کیا کہ باغ مذکور تمامی جنوبی ہندستان میں بےنظیری کا دم مارنے لگا دور دور سے لوگ اس کے دیکھنے کو آنے لگے " ۔

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ اس میں افعال کی تذکیر و تانیث کی صحت کا خیال رکھا گیا ہے اور جابجا متعدی افعال کے ساتھ " نے " بالکل صحیح طور پر استعمال کیا

کیا ہے، زبان کی سلاست اور روانی میں بھی بیّن فرق ہوچلا ہے، عربی اور فارسی ترکیبوں کا استعمال بھی بہت کم ہوگیا ہے۔ اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ بنگلور میں ان اخباروں کی اشاعت نے ایک مستقل اور دیرپا اثر پیدا کیا، یہاں تک کہ وہاں کی زبان منجھ گئی اور ادبی ذوق پیدا ہوگیا۔

میسور اخبار قاسم الاخبار کی تقطیع پر آٹھ صفحوں میں شایع ہوا کرتا تھا۔ اس کے ہر صفحے میں تین کالم اور ہر کالم میں اٹھائیس سطریں ہوتی تھیں۔ نامہ نگاروں کے علمی اور قومی مضامین کے علاوہ اس اخبار کے ایڈیٹوریل پُر از معلومات ہوتے تھے چنانچہ اس کی اشاعت مورخہ ۳ جون ۱۸۷۵ء میں ایک مفید ایڈیٹوریل مقالہ ہے جس کا عنوان یہ ہے:۔ "کیا اخباروں کی آزادی سرکار و رعایا کے لیے مفید ہے؟"۔ یہ دو صفحہ کا بسیط مضمون ہے جس میں اخبار کے فوائد پر اچھی بحث کی گئی ہے، لارڈ میکالے کی تجاویز آزادیٔ مطابع کی تائید کی گئی ہے۔ ذیل میں ایک مختصر سا اقتباس دیا جاتا ہے:۔

"اخباروں اور مطابع کو آزادی کا عنایت کرنا یہ بھی سرکار وقت کی ایک بڑی دانائی کی دلیل ہے۔ اس سے تو چنداں اخبار نویسوں کو فائدہ نہیں، ہاں سرکار و رعایا کے لیے یہ بڑے فائدہ کی بات ہے۔ سچی سچی باتوں کا اظہار، حکام ماتحت کی کارروائیوں کا افشا، رعایا کی مصیبتیں اور سرکار کی بعض غلطیوں کا اظہار یہ بجز اس کے ہو نہیں سکتا کہ اخباروں کو آزادی ملے۔ اگر اخباروں کو آزادی عنایت نہ کی جائے تو جو فائدے اب اخباروں کی بدولت سرکار و رعایا کو حاصل ہیں وہ ہرگز حاصل نہ ہوں گے۔ اخباروں سے عدم آزادی میں کیا توقع ہوسکتی ہے، یہی کہ سچی باتوں کا اخفا جائز رکھا گیا، سارا اخبار خوشامد سے بھرا ہوا ہے، کام کی بات ایک نہ لکھی گئی، ہزاروں ظلم رعایا پر اور لاکھوں سازشیں رعایا سے عمل میں آئیں مگر اخبار نویس نے ان کو ایسا ظاہر کیا کہ ظلم کو عدل اور سازشوں کو قومی ہمدردی کے جلسے بتلادیا، جب یہ صورت جائز رکھی گئی تو پھر سلطنت کو غرض معلوم............"

اس قسم کی صاف اور سلجھی ہوئی عبارت کی مثالیں ان اخبارات سے بہ کثرت تلاش کی جاسکتی ہیں - بنگلور کے اخبارات کی ایک اور خصوصیت قابل غور ہے کہ ان میں سے اکثر اپنی اشاعتوں میں کسی قسم کے اشتہارات شایع نہیں کرتے تھے - معلوم ہوتا ہے کہ طبع و اشاعت کے اخراجات صرف چندۂ خریداری سے پورے کیے جاتے تھے - اس صورت میں یہ قیاس غلط نہیں ہوسکتا کہ ان کے خریداروں کا حلقہ کافی وسیع تھا - بنگلور کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ سب سے پہلے یہیں سے جنوبی ہند کا پہلا مذہبی اخبار شایع ہونے لگا ، غدر کے بعد سے عیسائی مشنریوں نے ہندستانیوں میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً اشاعت مسیحیت کو ضروری سمجھا - صوبۂ مدراس میں عیسائی مشن نے تبلیغ مسیحیت کی مختلف شاخیں قائم کیں اور صرف مسلمان طلبہ میں اشاعت مسیحیت کے خیال سے شہر مدراس میں ہائی اسکول کھولا - بنگلور چھاؤنی میں عیسائی فوجوں کے قیام کی بدولت مشنریوں کو خوب موقع ملا - اس زمانے میں شمالی ہند سے عیسائیوں کے اخبار "نور افشاں" اور "کوکب ہند" شایع ہوا کرتے تھے اور اپنی اشاعتوں میں ہمیشہ اسلام کے خلاف زہر اگلا کرتے تھے - ان مسیحی اخبارات کا اثر تھا کہ جنوبی ہندستان کے مشنری بھی آئے دن مسلمان علما سے مقابلہ و مناظرہ کیا کرتے تھے - بنگلور اور مدراس گویا جنوبی ہند کے دنگل تھے اور یہاں ہمیشہ مناظروں اور مباحثوں کے جلسے ہوا کرتے تھے - غرض اس ماحول میں بنگلور کے ایک جوشیلے مسلمان محمد شریف صاحب نے ۱۸۶۲ء میں ایک عشرہ وار اخبار بنام "منشور محمدی" نکالنا شروع کیا - یہ پہلے پہل منشی محمد قاسم صاحب غم مدیر قاسم الاخبار کے چامراج پریس سے شایع ہوتا تھا - اس کے بعد اپنے مطبع فخرالاسلام سے نکلنے لگا - غالباً یہ وہی اخبار ہے جس کے نام پر سر سید مرحوم نے ان الفاظ میں اعتراض کیا تھا :—

"۔۔۔۔ یہی خیالات ہیں جن کے سبب سے لوگ ایسی باتیں کر بیٹھتے ہیں جن سے ہمارا دل ٹوٹ کانپ جاتا ہے ، ایک اخبار نکالا جاتا ہے جس کا نام (توبہ توبہ) "منشور محمدی" رکھا جاتا ہے - کیوں اس کا دل پھٹ نہ گیا اور کیوں اس کا قلم

ٹوٹ نہ گیا جو اس نے ان لفظوں کو لکھا...... "[۱]

اس اخبار کی سالانہ قیمت مع محصول ڈاک پانچ روپے دس آنے تھی۔ البتہ علم دوست مخیر اصحاب وقتاً فوقتاً اس اخبار اور مطبع کی امداد کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے یہ اخبار تقریباً بیس پچیس سال تک دینی خدمت انجام دیتا رہا۔ اس کا مقصد وحید یہ تھا کہ مذہب عیسوی کی تردید کی جائے۔ لیکن کبھی کبھی اثبات حقانیت اسلام کے سلسلہ میں ہندو مذہب اور معتقدات کی تردید بھی کی جاتی تھی۔ آریہ سماج کے بانی مہاشے دیانند سرستی کے خلاف متعدد مضامین اس کی مختلف جلدوں میں پائے جاتے ہیں۔ اخبار کے سرورق پر اردو فارسی قطعات درج ہوتے تھے۔ عام طور پر سال کا ایک تاریخی قطعہ علیحدہ ہوا کرتا تھا۔ ۱۲۹۴ھ کی جلد پر ذیل کا قطعہ درج ہے جس سے تاریخ اجرائے اخبار کا پتہ لگتا ہے:-

دچو منشور محمد کرد روشن مہر شوکت را برنگ ذرہ شد بےزیب و زینت کوکب ہندی
پے تاریخ اجرا شد بلا اندیشہ و دقت خرد گفتا بر افتادہ ز عزت کوکب ہندی

۱ ۴ ۱۲۹۴-۵=۱۲۸۹

اس اخبار کی چھٹی جلد کی اشاعتوں میں ذیل کے اردو قطعات درج ہیں:-

(۱) منشور محمدی الٰہی شایع ہو ز ماہ تا بہ ماہی
انجیل و زبور پر ہو دائم صد بار مفخر و مباہی

(۲) مہر منشور محمد سے دلا مجلس کونین روشن کل ہوئی
از پئے تاریخ نورافشاں لکھو شمع نورافشاں بہ کیسی کل ہوئی

اس اخبار کی مختلف جلدوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اخبار ہندستان بھر میں اپنی آپ نظیر تھا۔ یو۔پی، پنجاب، بنگال اور بمبئی کے بہت سے علما اور محققین اس اخبار کے نامہ نگار تھے۔ اس کے مستقل مضمون نگاروں کی فہرست میں

---

[۱] حیات جاوید جلد دوم صفحہ ۱۴۲ مطبوعہ ۱۹۰۱ع نامی پریس۔ سر سید مرحوم نے ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں اس تجویز پر کہ چیئرز کے عوض سبحان اللہ کہا جائے اعتراض کیا تھا اور اس کو شعائر اسلام کے تہتک میں داخل کیا تھا۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے بعض ایسے اخبارات کے نام گنائے ہیں جن کے نام ان کے خیال میں سوء ادب پر محمول کیے جاسکتے ہیں۔

ذیل کے مشاہیر اصحاب بھی شامل تھے :- "شیخ رحیم بخش رئیس بٹالہ گورداسپور ، مرزا غلام احمد رئیس قادیان ، مرزا سلطان احمد از گورداسپور ، سراج الدین احمد از جبل پور ، کرم الہی (جماعت ہشتم) از گجرات پنجاب ، مولوی محمد سلیم اللہ فیض آبادی مولوی میرزا موحد جالندھری ، مولانا محمد علی کانپوری" - ذیل میں صوبۂ مدراس کے علاوہ ان شہروں کی ایک مجمل فہرست دی جاتی ہے جہاں اس کے خریدار اور معاون موجود تھے :- " امرتسر - ایبٹ آباد - اکولہ - اجمیر - اندور - امان پور - الہ آباد - بمبئی - بھوجپور - بان کوٹ - بجنور - بستی - پونا - پرتاب گڑھ - دھلی - رنگون - سورت - سیا - سکندرآباد - عظیم آباد - پٹنہ - علی گنج - فیروز پور - قصور - شاہ آباد کاشی پور - کرولی - کمپ مئو - کٹرہ گڑھی - مہر پور - لودھیانہ - معین پور - مرادآباد مظفرگڑھ - مارھرہ - میرٹھ - متھرا - مہدپور - میرزا پور - نصیرآباد - وزیرآباد - ھردوئی -

یہ اخبار بارہ صفحوں کا فلسکیپ تقطیع پر شایع ہوتا تھا۔ اس میں مذہبی مضامین اور مناظروں کے علاوہ اسلامی ممالک کی مختصر خبریں عربی ، انگریزی اور اردو اخبارات سے لی جاتی تھیں - کبھی کبھی بعض شہروں سے نامہ نگار مقامی حالات لکھ بھیجتے تھے - اس کی چھٹی اور ساتویں جلد میں ذیل کے اردو اخبارات و رسایل کے حوالے موجود ھیں :- عمدۃالاخبار فتح گڑھ - کشف الاخبار بمبئی - جریدۂ روزگار مدراس - عمدۃ الاخبار شاھی مدراس - شمس الاخبار مدراس - لوح محفوظ مرادآباد - سیف الاسلام بمبئی - نسیم سحر - اخبار انجمن پنجاب - قاسم الاخبار بنگلور - رھبر ھند - نصرت الاخبار دھلی - خیر خواہ عالم - اخبار اردو اکولہ - خورشید دکن -

اس اخبار کے مضامین یا تو اقتباسات تھے یا مستقل مضمون نگاروں کے فیض قلم کا نتیجہ تھے - ذیل میں جس عبارت کا نمونہ پیش کیا گیا ہے وہ غالباً ادارت کی جانب سے ہے :-

" اخبار منشور محمدی سر چشمۂ فیض سرمدی چھے برس سے جاری ہے - الحال بہ فضل ایزد باری سال ہفتم کی باری ہے ، اس کے انوار آفتاب عالمتاب توحید نے روشنی چراغ

تثلیث کو مٹادیا اور تیرہ روان کوئی جہل و بے جانی کو رستہ دین حق و یقین کا دکھادیا لیکن۔

گر نہ بیند بہ روز شپرہ چشم   چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

بہ مقابلہ اہل تثلیث کیا کیا جواب دنداں شکن دے رہا ہے، دین محمدی کے بدخواہوں کے دھجیاں لے رہا ہے، اس کی نورافشانی نے نورافشاں کو مات کیا، کوکب ہند و شمس الاخبار کو ایک بضاعت مزجات بنادیا۔ کس کی تاب کہ اس کے سامنے رونق پائے اور کون ایسا ستارہ ہے کہ آفتاب کے آگے چمک دکھائے، کہاں نور کہاں نار، کہاں گلزار کہاں خار، کہاں حقیقت کہاں مجاز، کہاں سوز کہاں ساز "۔

"اس عبارت میں جس شمس الاخبار کا ذکر ہے وہ عیسائیوں کا پندرہ روزہ اخبار تھا جو لکھنؤ سے پادری کریون صاحب کے زیر اہتمام شایع ہوا کرتا تھا، آٹھ سال کے بعد اسی اخبار کا نام بدل کر کوکب ہند رکھا گیا۔ چنانچہ منشور محمدی کے پہلے صفحہ پر جو نظم شایع ہوا کرتی تھی اس کے اشعار میں اسی کی طرف اشارہ ہے :-

اس کے انوار سے نہیں ہے عجب   شمس گھٹ گھٹ کے گر بنے کوکب
شمس تاباں کو جب کرے مستور   کیوں نہ کوکب کو وہ کرے بےنور "

اس اخبار میں مذہبی مضامین کے علاوہ خاص طور پر یہ اہتمام کیا جاتا تھا کہ اسلامی ممالک کی اور بالخصوص حکومت ترکیہ کی خبریں شائع ہوں۔ چنانچہ جنگ روم و روس کے سلسلے میں مختلف اخبارات سے مسلسل خبریں نقل کی جاتی تھیں اور ترکوں کی مالی امداد کے لیے متعدد مضامین اور فتوے شائع ہوتے تھے، الجوائب اور اخبار دارالخلافۃ استنبول سے مضامین اور خبریں ترجمہ کرکے شایع کی جاتی تھیں، غازی عثمان پاشا اور پلونا کے معرکے کے متعلق نہایت تفصیلی مضامین اس میں موجود ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اخبار دارالخلافہ میں جو استنبول سے فارسی میں شایع ہوتا تھا، کبھی کبھی اردو میں بھی مختصر مضمون شایع ہوتے تھے۔ چنانچہ منشور محمدی کی اشاعت نمبر ۲۸، جلد ششم میں اس اخبار کا ایک فارسی اقتباس موجود ہے اور اس کی دوسری اشاعت نمبر ۲۷ جلد ششم میں ذیل کا اردو اقتباس درج ہے :-

«در زبان اردو از دارالخلافہ»

سبحان اللہ یہ کیا عجیب حال ہے جس کے دیکھنے سے آدمی دریائے حیرت میں مستغرق ہوتا ہے۔ ان دنوں میں دارالخلافہ استنبول کے محلوں میں موکب ھمایوں کے واسطے لوگوں کا نام دفتر نظام یعنی دفتر لشکر میں لکھا جاتا ہے۔ اگرچہ قاعدہ اور اصول اس کا یہ ہے کہ بیس برس سے چالیس برس تک جن کی عمر ہو اونھیں کو دفتر عسکر میں قید کرتے ہیں مگر ہر ایک کو ایسا ہی شوق پیدا ہوا ہے کہ جس کی عمر پچاس برس کی ہو وہ ایسا کہتا ہے کہ میری عمر ابھی چالیس کو نہیں پہنچی ہے مجھے بھی عسکر میں داخل کرو اور جو بارہ تیرہ برس کے ہیں وہ بھی ایسا کہتے ہیں کہ ہماری عمر ابھی بیس کو نہیں (؟) پہنچی ہے پھر کس واسطے ہم کو بھی سپاہیوں میں داخل نہیں کرتے ہو کہ ہم بھی جا کر دشمن سے لڑیں۔ سرکاری مامور ان کو تسلی کے واسطے کہتے ہیں ابھی کچھ احتیاج نہیں جب کچھ لزوم ہو تم کو بھی بلائیں گے۔ اب تم آرام کرو مگر وہ روتے ہیں اور کہتے ہیں عجب بات دشمن ابھی ہمارے وطن میں ہو اور ہم آرام کریں ہم ضرور جنگ کرنے کو جاویں گے یا تو دشمن کو مار کے وطن سے نکالیں گے یا شہید ہوکے ثواب پاویں گے۔" اب استنبول میں دن رات قواعد ہورہی ہے اور ہر روز بہت سے مجاھدین استنبول میں آکے میدان جنگ کو جارہے ہیں۔ وزرائے دولت بھی رات دن جمع ہوکے مشورت کر رہے ہیں "

خط کشیدہ جملوں اور محاوروں میں بیرونی زبان کا اثر صاف طور پر نمایاں ہے اور یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ یہ اسلوب بیان کسی ہندستانی اردو داں کا نہیں ہے۔ اخبار دارالخلافہ مطبع مہران افندی میں چھپتا تھا اور زیر اہتمام اسکندر افندی جادہ باب عالی استنبول سے شایع ہوتا تھا۔ اسی مطبع سے اسکندر افندی کی زیرنگرانی ۱۸۷۸ء میں ایک پندرہ روزہ اردو اخبار شایع ہونے لگا جس کا نام «ترجمان مشرق» تھا [۱]۔ غالباً ترجمان مشرق کی اشاعت سے پہلے وقتاً فوقتاً اردو مضامین

---

۱ سوانح عمری اخبارات حصہ۔ اول، اختر شاہنشاہی، صفحات ۸۱ اور ۱۱۸؎

اخبار دارالخلافه میں شایع کیے جاتے تھے لیکن جنگ روم و روس کے زمانے میں جب عالمگیر اسلامی همدردی اور اخوت کی تحریک ضروری سمجھی گئی تو هندستانی مسلمانوں سے تعلقات بڑھانے کے لیے شاید اس اردو اخبار کو جاری کیا گیا ۔ هم نے گزشته صفحات میں ذکر کیا هے که اسی سال مدراس کے شمس الاخبار کی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور دربار خلافت سے تمغۂ مجیدی مرحمت هوا ۔ ان روز افزوں تعلقات کی بنا پر شاید هندستان کے اردو اخبارات کو تو استنبول کے اصلی واقعات سے واقف کرانے کے لیے اس اخبار کو جاری کیا گیا ۔ هندستان کے مختلف اخبارات میں اس کے اقتباسات پائے جاتے هیں ۔ ذیل میں منشور محمدی کی ایک اشاعت سے ترجمان مشرق کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا هے تاکه استنبول کے اردو دانوں کا اسلوب بیان واضح هوجائے ۔ ولایت بوسنیا و هرزی گوبنا میں اسٹریا کی دخل دهی پر اخبار "ترجمان شرق" کا بیان هے ۔

" یا حکومت اوستریا مخلاف رائے کانگرس[1] جو که هیئت مجموعه یورپ سے عبارت هے اس کام کو اجرا کرنے میں کس طرح پر جسارت کرتی هے اس سے معلوم هوتا هے که دولت اوستریا اس کام میں تنها نهیں هے بلکه یا کانگریس نے مخفی طور پر اس کو ایسے افعال شنیعه کے اجرا کرنے کے لیے امر دیا هے ویا سب سے بڑی ایک دولت کے معاونت سے کام کررهی هے ۔ چونکه کسی طرف سے اس پر اعتراض بهی نهیں هوتا هے ۔ جبکه ایسا هو پس اظهر من الشمس هے که دولت اوستریا اور بهی بهت سے کام جو که عهدنامه برلین میں محرر نهیں هیں ان کو بهی کرنا چاهتی هے چونکه ویانه کی جراید اس باب میں بعضے چیزوں کو بصورت آشکار بهی تحریر کرتے هیں ۔ و اخبار تار برقی بهی دنیا کی ایک گوشه سے بهی دوسرے گوشے تک افعال تجاوز کارنۂ (؟) اوستریا کو نشر کررهے هیں ۔ اگرچه برلین کی عهد نامه میں دولت اوستریا کا ولایت بوسنه و هرسک میں داخل هونا و (یکی بازار) میں داخل نه هونا صراحةً بیان هوا هے ۔ اما چه فایده که آج حکومت اوستریا وهاں بهی داخل هونا چاهتی هے، جو که خبر ویانه سے آئی هے اس سے ایسا معلوم هوا هے

[1] کونگرس سے مراد برلین کانگریس هے؛ یورپین زبانوں میں عموماً یهی تلفظ رائج هے ۔

کہ دولت اوسٹریا ولایت بوسنہ و ہرسک میں بلاشرط داخل ہونگے بعد تنہا (یکی بازار) کے لیے دولت عثمانیہ کے ساتھ ایک مقاولہ نامہ کو عقد کرنا چاہتی ہے و لیکن اسی مادہ میں جو کہ برلین کی معاہدہ میں داخل نہیں ہے آیا دولت عثمانیہ دولت اوسٹریا کے ساتھ کس طرح پر ایک مقاولہ نامہ عقد کرسکے گی گرچہ اوسٹریا نے ولایت بوسنہ و ہرسک میں داخل ہونے کے لئے برلین کے کونگرس کے قرار کو وسیلہ اتخاذ کیا مگر ہم نہیں جانتے ہیں کہ (یکی بازار) میں داخل ہونے کے کیا وسیلہ اتخاذ کرے گی و کس طرح پر مقاولہ نامہ کو تکلف کرے گی ۱ .... ، علی العموم منشور محمدی کی عبارت میں عربی اور فارسی ترکیبوں کی بہتات ہے اور مولویانہ طرز تحریر کی ساری خصوصیتیں موجود ہیں ، عربی قواعد کی رو سے ہندی الفاظ کی جمع بھی بنائی گئی ہے - جابجا « اتواپ » اور « پوادر » (جمع توپ اور پادری) اور اسی قسم کے الفاظ مستعمل ہیں - منشور محمدی کی پرانی جلدوں کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کے معاون اور مضمون نگار زیادہ تر شمالی ہند اور پنجاب کے باشندے تھے - مدراس کے مضمون نگاروں میں قابل ذکر مولوی سید نظام الدین صاحب فخری ہیں جنھوں نے اپنے ان مناظروں کی تفصیلی روئدادیں شایع کی ہیں جو ان کے اور پادری گولڈ اسمتھ کے مابین پیش آئے تھے - منشور محمدی کی جلدیں اس قسم کے مذہبی مناظروں اور مباحثوں کی روئدادوں سے بھری پڑی ہیں -

بنگلور کے اخبارات کا ذکر ختم کرنے سے پہلے اس دور کے ایک اور اخبار کا تذکرہ ضروری ہے - یہ اخبار « محافظ بنگلور » کے نام سے اپریل ۱۸۷۵ع میں جاری ہوا - پہلے صفحے کے بالائی حصہ میں نصف دائرہ کی سی شکل میں اس کا انگریزی نام « دی بنگلور گارڈین » درج ہوتا تھا - یہ اخبار کسی انفرادی کوشش کا نتیجہ نہ تھا ، بلکہ ایک انجمن « زمرۂ احباب » کی جانب سے مہینے میں دو مرتبہ آٹھ صفحوں میں شایع ہوا کرتا تھا - زمرۂ احباب کے سکرٹری محمد عبدالمجیب کے زیر اہتمام منشور محمدی کے مطبع بحرالاسلام میں یہ طبع ہوتا تھا - اخبار کی اشاعت کا مقصد سرورق پر ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے :-

۱ منشور محمدی شمارہ ۲۷ جلد ۷ -

« قومی ہمدردی اور ملکی محبت کو حقانیت کی تلاش اور سچائی کے اظہار میں تمام کرنا ہمارا شعار ہے »۔

«....اس میں مضامین مفید عام خصوصاً ہندستانیوں کے امور تمدن و معاشرت کی ترقی اور اصلاح کی نسبت مندرج ہوا کریں گے اور نیز پولیٹکل مضامین بھی جن کی بنا دیسیوں کی رفاہیت اور ترقی پر ہوگی نیک نیتی سے بحث کی جائےگی اور جو مضمون کہ خواص حکام کی اطلاع کے لیے لکھا جائےگا اس کا انگریزی ترجمہ اس پرچے کے اخیر صفحے میں مندرج ہوا کرےگا.....» ۔

اس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ انجمن زمرۂ احباب کے قیام کا غالباً یہ بھی ایک مقصد تھا کہ حکام تک اپنی شکایتوں کو پہنچایا جائے اور قومی اور ملکی مہم معاملات کی جانب ان کی توجہ منعطف کرائی جائے ۔ اراکین زمرۂ احباب کو یہ بلاقیمت بھیجا جاتا تھا۔ مضامین میں تنوع کے لحاظ سے یہ اخبار خاصا دلچسپ تھا، علمی مضامین کے علاوہ دلچسپ قومی مضامین بھی شایع کیے جاتے تھے۔ منشور محمدی کے بعض مضمون نگاروں کے نام بھی اس کے کالموں میں پائے جاتے ہیں ۔ اپنی طرز، ہیئت، تقطیع وغیرہ کے لحاظ سے یہ قاسم‌الاخبار اور میسور اخبار کے مماثل تھا۔

اس کی اشاعت نمبر ۳ جلد اول میں ایک سائنٹفک مضمون اس عنوان پر ہے کہ "دریا (سمندر؟) کا پانی کیوں کھارا ہے" ۔ اسی اشاعت میں دوسری جگہ ضلع سیلم میں مسلمان لڑکوں کے لیے ابتدائی تعلیم کے مدرسوں کا ذکر ہے اور یقیناً یہ بات آج بھی حیرت کی نگاہ سے دیکھی جائےگی کہ ضلع سیلم کے صرف ایک سب‌ڈیویژن ہسور میں جس میں کشنگری، دھرم‌پوری وغیرہ مقامات شامل ہیں، بارہ ہندستانی مدرسے کھولے گئے اور لوکل فنڈ اور رزلٹ گرانٹ سے ان مدرسوں کے اساتذہ کی تنخواہیں دی جاتی تھیں ۔ مدیر اخبار نے نامہ نگار کی مسرت پر ذیل کے عبرت انگیز الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:-

« ہمارے کارسپانڈنٹ صاحب کی خوشی کو جو خدمت استادی پر مامور ہونے پر ظاہر کی گئی ہے، دیکھنے سے یہ دردناک حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ اس بے رحم زمانے نے ہماری

قوم کو افلاس کے کس نہایت درجہ میں چھوڑا ہے کہ آٹھ دس روپیہ کی ماہواری چلنا بھی ان کے پاس مغتنمات سے گنا جاتا ہے۔ کشنگری اور دھرم پوری میں ایک زمانہ ایسا گزرا ہے کہ بڑے بڑے مسلمان سرداروں اور مقدس مشائخین کے وجود سے ان مقامات کی بزرگی زیادی ہوتی تھی۔ ٹیپو سلطان کے ایک نامور سپہ سالار جنھوں نے نپولین بونیپارٹ شہنشاہ فرانس سے کمک چاہنے کے لیے ٹیپوسلطان کی جانب سے ایلچی مقرر ہوکے فرانس گئے تھے اور نپولین سے تمغے حاصل کیے اور آخر کو سلطان کے جہازوں کے بیڑے کے مختار ہوکے خطاب میریم حاصل کی تھی اب ان کے ایک نواسے بھی ان مدرسوں کے ایک استاد مقرر ہوئے ہیں۔ اللّٰہ اکبر اگر کوئی مورخ دنیا کی تمام قوموں میں نہایت درجہ کی تنزل یافتہ قوم کو ڈھونڈھے تو مسلمانوں سے بڑھکر بدنصیب کسی کا نشان نہیں مل سکے گا۔ مسلمانوں کو آئندہ کی ترقی کے سامان مہیا کرنے اور ادبار کو آپ سے دور رکھنے کے تدابیر عمل میں لانے کے لیے یہ مثالیں نہایت پر تاثیر ہیں'۔

کس قدر دلخراش حقیقت ہے ! آج بھی یہ واقعہ باعث عبرت ہے' صرف یہی نہیں بلکہ آج کشنگری اور دھرم‌پوری کے علاقے میں اردو کی کس مپرسی کا مقابلہ ستر سال پہلے کے واقعہ سے کیا جائے تو افسوس ہوتا ہے کہ ہم روز بہ‌روز اپنی زبان اور اپنے علوم سے بےبہرہ ہوتے جاتے ہیں۔

اس اخبار میں بھی علی العموم ۱۸۷۵ع کے دیگر اردو اخبارات کی طرح ملہرراؤ کے مقدمہ زہرخورانی کے متعلق تفصیلی کیفیتیں درج ہیں اور کہیں کہیں لندن‌پنچ یا دیگر اخبارات کی رائے پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ ایک اور دلچسپ خبر جس سے مدراس کی قدیم ترین اسلامی درس گاہ کو ایک گونہ تعلق ہے۔ اسی اشاعت کے ایک اور کالم میں پائی جاتی ہے :-

" مدراس کے مسلمانوں اور خصوصاً خاندان والا جاھی کے ارکان کی یہ تجویز ہے کہ ایک معقول رقم عام چندے سے فراہم کرکے مدراس پریسیڈنسی کالج میں لارڈ ہوبارٹ صاحب بہادر کے نام سے اسکالرشپ قائم کریں اور یہ اسکالرشپ خاص مسلمان طالب‌علموں

کو دیا جاوے جو سالیانہ امتحان میں الیق نکلیں اور نیز اون کے قد کے برابر ایک تصویر بنوا کے مدرسۂ اعظم مدراس میں لٹکائی جائے چنانچہ اس یادگار کے لیے چندہ جمع کیا جاتا ہے " ۔

غالباً اس پر عمل نہیں کیا گیا اور یہ تجویز شاید رائے و مشورہ کی مد سے آگے بڑھنے نہ پائی ۔

اس اخبار میں برقی خبروں کے مختصر خلاصے اور ہند و بیرون ہند کی دلچسپ خبریں شائع کی جاتی تھیں اور بسا اوقات لطیفے اور دلکش اقتباسات ہم‌عصر رسائل اور اردو اخبارات سے نقل کیے جاتے تھے ۔ قاسم‌الاخبار، میسور اخبار اور منشور محمدی کے مقابلے میں اس اخبار کو شاید زیادہ فروغ حاصل نہیں ہوا ۔اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کی مدت اشاعت ان اخبارات کے مقابلہ میں بالکل کم رہی ۔

اس دور کے اخبارات میں ہم نے بنگلور کے اخباروں کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور قبل اس کے کہ ہم ۱۸۸۰ع کے بعد شایع ہونے والے اخبارات کا ذکر کریں، مدراس سے نکلنے والے ان بعض اخبارات کا ذکر ضروری ہے جو ۱۸۸۰ ع سے پہلے شائع ہونے لگے۔ ان میں قابل ذکر مدراس کا مشہور ہفتہ وار اخبار "جریدۂ روزگار" ہے* ۔ شمس‌الاخبار کی مقبولیت عام کا اثر تھا کہ رائی‌پیٹھ کے مطبع حیدری میں سید مرتضیٰ شاہ قادری افندی کے زیر اہتمام ۱۸۷۵ ع میں یہ اخبار جاری ہوا ۔ اس میں عام خبروں کے علاوہ خاص طور پر اس کا انتظام تھا کہ سلطنت آصفیہ کے متعلق زیادہ سے زیادہ خبریں شایع کی جائیں ۔ کچھ مدت کے بعد تو اس اخبار کے اکثر صفحات محض حیدرآباد کی خبروں اور وہاں کے اشتہارات اور اعلانات کے لیے وقف ہوگئے ۔ حکومت کی جانب سے امداد کے علاوہ اس کے اکثر خریدار بھی ممالک محروسۂ سرکار عالی کے باشندے تھے۔ ابتدائی زمانے میں یہ اخبار بہت مشہور رہا ۔ ہندستان کے مختلف اردو اخبارات میں اس،

---

* پنڈت کیفی نے اپنے مضمون "اب سے ادھی صدی پہلے اردو اخبار" میں اس کا مقام اشاعت حیدرآباد، دکن بتایا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ غالباً یہ خیال اس وجہ سے ہوا ہو کہ اس اخبار میں زیادہ تر خبریں مملکت آصفیہ سے متعلق ہوا کرتی تھیں ۔ جریدۂ روزگار گزشتہ جنگ عظیم کے زمانے میں روزانہ ہوگیا تھا ،اور ۱۹۲۰ کے بعد بھی کبھی کبھی یہ برآمد ہوا کرتا تھا۔

کے اقتباسات کی کثرت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی اپنے ہم‌عصر شمس‌الاخبار کی طرح مقبول رہا ہوگا۔ سلطنت آصفیہ کے متعلق اس اخبار کی پالیسی یہ تھی کہ برسراقتدار اصحاب کی تائید کی جائے۔

اس زمانے میں بنگلور اور مدراس میں اخبارات کی کثرت اور ان کی کمی مقبولیت حکومت ترکیہ اور روس کے مابین جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے تھی، جریدۂ روزگار بھی شاید اسی بنا پر جاری ہوا اور اس کی ابتدائی جلدوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شمس‌الاخبار اور جریدۂ روزگار ترکوں کے متعلق خبروں کو شایع کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ مہتمم اخبار سید مرتضیٰ شاہ قادری کے نام کے ساتھ «افندی» کا الحاق ہمارے اس قیاس کا شاہد ہے۔ شمس‌الاخبار کے مدیر محمد نصیرالدین کھٹالہ بھی اپنے نام کے ساتھ برابر «افندی» لکھا کرتے تھے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ حضرات ترکی سے براہ راست خط و کتابت رکھتے تھے اور ان مکاتبات و مراسلات میں ان کو «افندی» کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا جس کو انہوں نے باعث اعزاز خطاب سمجھ کر اپنے ناموں کے ساتھ شامل کرلیا۔ جریدۂ روزگار نے بھی حکومت ترکیہ کی امداد میں بہت کچھ حصہ لیا تھا اور متعدد دفعہ چندہ کی اپیل میں پر زور مضامین شایع کیے تھے۔ عبارت کے لحاظ سے اس اخبار کو شمس‌الاخبار پر ترجیح نہیں دی جاسکتی البتہ اس کے آخری دور میں جب کہ اس کی عنان ادارت محمد عبداللطیف صاحب کے ہاتھ میں تھی تو اس کے لب و لہجہ اور تحریر میں خوبی اور سنجیدگی نمایاں ہوگئی تھی۔

یہ اخبار متوسط تقطیع کا تھا اور سولہ صفحوں پر شایع ہوا کرتا تھا۔ اس کی سالانہ قیمت بھی بحسب تفاوت مدارج خریداراں متفاوت تھی۔ وقتاً فوقتاً اس میں مشاہیر شعرا کی نظمیں بھی شایع کی جاتی تھیں۔ ذیل میں اس کے دو ایک اقتباس دیے جاتے ہیں جن سے اس اخبار کی عبارت اور طرز تحریر کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ یہ اخبار اپنی اشاعت ۲۴ جلد سوم بابتہ ۱۸۷۷ع میں جنگ روم و روس کے سلسلہ میں ملکہ وکٹوریہ کے اعلان غیر جانبداری پر ذیل کے الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے:-

«البتہ یہ بات تو ہے کہ جب ہماری ملکہ عالیہ کسی ایک کے جانب نہ ہو تو رعایائے سلطنت بھی کسی ایک کے طرفدار نہ بنیں مگر ہم مسلمان رعایائے سلطنت قیصریہ جو ترکی سلطنت کی جانب زیادہ میلان رکھتے ہیں اس کا باعث یہ ہے کہ سلطان روم اہل اسلام کے پادشاہ ہونے کے سوا جتنے متبرک و مقدس مقامات و مواضعات مذہبی ہیں ان کے متولی و مجاور یہی سلطان ہیں اور ہم سب مسلمان اس شہنشاہ اسلام کو مذہبی طور سے اپنا پیشوا و امیرالمومنین و امام‌المسلمین سمجھتے ہیں اور ان سے نہایت رسوخیت و اعتقاد سے ملتے ہیں اگرچہ کہ بسبب بعدیت ہم ان کے مخالف سے جنگ کرنے کے مجاز نہیں ہوتے مگر ان کی فتح کو ہماری فتح اور ان کی شکست کو ہماری شکست اور ان کے لشکر کے بیوگوں و یتیموں و مجروحوں کے آنسو پونچھنے اور ان کے سر پر کپڑا ڈھانکنے اور مرہم پٹی باندھنے کو بہترین قومی ہمدردی اور عبادت تصور کرتے ہیں اور ۵۷ع کے غدر کے بعد جو اشتہار ملکہ عالیہ سے اصدار پایا وہ اشتہار ہم کو ہمارے مذہبی امورات کی آزادی پر آمادہ کرتا ہے اور خود گورنمنٹ عالیہ نے اپنے اس اشتہار میں کسی ایک مذہبی معاملات میں دخل دہی کرنے کو مستثنا کرلیا ہے بلکہ وعدہ کیا ہے کہ ہم کسی کے مذہب میں دخل دہی نہ کریں گے بلکہ کلکتہ و مدراس و بمبئی کے مسلمانان اپنے مافی‌الضمیر کی اطلاع ملکہ عالیہ کے حضور میں درپیش کرچکے بلکہ یہ تمنا بتلائی کہ ہم سب رعایاے ہندستانی اپنے مذہب و ملت کو تھامنے اور مقدس و متبرک مقامات کو کسی طور کا آسیب نہ پہنچنے کے لیے سلطان اسلام کی تائید کریں بلکہ ہمارے دین و ایمان کے دشمن پر تلوار اٹھاویں»۔

اسی جلد میں اگست ۱۸۷۷ع کی ایک اشاعت میں مدیر جریدۂ روزگار نے اخبار «ٹروتھ» سے ایک انوکھی تجویز نقل کی ہے جس میں ایک انگریز نے یہ مشورہ دیا ہے کہ آیندہ «نوجوانان ہند کو عہدہ ہائے حکومت عنایت ہوں» تو ساتھ ہی یہ انتظام بھی کردیا جائے کہ نازنینان انگلستان ان کے کاشانوں کی زینت بنیں تاکہ عہدہ‌دار «طرز معاشرت و معاملت میں یگانہ آفاق» ہوں اور «امور مملکت میں موافقت و موانست» رہے «اور انگلستان کی محبت کا نقش مرتسم ہوجائے»۔ مضمون نگار کے خیال میں یہ ایسی تجویز

ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے کے بعد مشنریوں کی چنداں حاجت باقی نہ رہے گی اور انگلستان اور ہندستان بہت جلد ایک ہوجائیں گے۔ لیکن " احتمال یہ ہے انگلش لیڈیاں شاید ہندستانی رئیس زادوں کے ساتھ اپنی شادی اس وجہ نہ پسند کریں کہ وہ لوگ گندم گوں سیہ فام ہوتے ہیں" مضمون نگار نے خود اس احتمال کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے:-

" ہم انگلش لیڈیوں سے یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا ہندستان کے لوگ پرتگیز اور اسپین اور برازیل کے لوگوں سے بہت زیادہ سیاہ ہیں جو ان مقامات کے رؤسا کے ساتھ انگلش لیڈیاں شادی کرنے پر راضی ہوجاتے ہیں باوجودیکہ وہاں کے لوگوں کے رنگ ہندستانی لوگوں سے زیادہ سیاہ ہیں پس ہندستانی رئیس‌زادوں کا تناکح کیوں نہیں پسند کرتے ہیں"۔

جریدۂ روزگار نے اس تجویز کو نقل کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار ذیل کے الفاظ میں کیا ہے:-

" امرازادے ہمارے ملک کے اوس سفید چمڑے کو اون کے پسند نہیں کرتے جس میں چونچلاپن و ناز و نخرا نہ ہو گو وہ حور بھی ہو پسند نہیں ہے۔ یہ تو ظاہری سبب ہوا باطنی ناراضی مذہب کی ہے ایسے رنڈیوں کے ورغلانے سے دیندار اپنے دین سے پھرتا نہیں بلکہ ہزارہا جائے ایسا ہوا ہے کہ خود لیڈیاں مسلمان ہوگئے اور اون سے جو اولاد ہوئی وہ بھی مسلمانی پر ہی رہے اس حالت میں عورتوں کے عنایت کی کیا ضرورت ہے اگر حق پوچھو تو عدل و انصاف گورنمنٹ کا مطیع و منقاد بناتا ہے اور ویسی محبت و الفت فقط نیک رویہ سے حاصل ہوتی ہے"۔

سید محمد مرتضیٰ شاہ قادری کے زیر اہتمام ۱۸۷۶ع میں منشور محمدی کی تقلید میں ایک پندرہ روزہ مذہبی رسالہ ظہیرالاسلام کے نام سے جاری ہوا لیکن یہ بہت جلد بند ہوگیا۔ یہ بھی جریدۂ روزگار کے مطبع ہی میں طبع ہوتا تھا۔

اب تک جن اخبارات کا تفصیلی ذکر آچکا ہے ان کی طرز تحریر میں باستثنائے معدودے چند ایک گونہ یکسانیت پائی جاتی ہے اور یہ صاف ظاہر ہے کہ بعض خصوصیتیں ان میں مشترک ہیں۔ سب سے پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ عربی اور فارسی ترکیبیں

ان اخبارات میں بہت زیادہ استعمال کی جاتی ہیں اور اسلوب تحریر میں بھی فارسی اور عربی کی تقلید کی جاتی ہے۔ جمع الجمع کا استعمال بہت کثرت سے ہے؛ مثلاً امورات، مواضعات، اھالیان، عمائدین اور ھنودوں کے سے الفاظ ھر اخبار کے صفحات میں پائے جاتے ھیں۔ عربی قواعد کے مطابق ہندی الفاظ کی جمع بنائی جاتی ہے۔ الفاظ کی تذکیر و تانیث کے متعلق کسی خاص قاعدے کی پابندی نہیں پائی جاتی۔ ایک ھی لفظ کہیں مذکر مستعمل ہے تو کہیں مونث اور بسا اوقات مذکر کو مونث اور مونث کو مذکر استعمال کیا جاتا ھے۔ حروف ربط کے ماقبل الفاظ میں "دن" کی جمع کے عوض الف نون کی جمع کا استعمال زیادہ ھے۔ کسی فقرے میں ضمیر فاعل ھو اور وھی مفعول بھی واقع ھو یا اضافی حالت میں ھو تو بجائے اس کے کہ اپنا، اپنی یا اپنے حسب موقع استعمال ھوں اسی ضمیر کی مفعولی اور اضافی حالت کو دھرایا جاتا ھے۔ ھندی الفاظ کے مابین حرف عطف 'اور' کے عوض "و" بالعموم مستعمل ھے۔ فارسی اور ھندی اور عربی اور ھندی الفاظ میں بھی صرف "و" کو عطف قرار دیا جاتا ھے۔ 'نے' کے استعمال میں بھی اکثر جگہ سہل انکاری سے کام لیا جاتا ھے۔ اس دور کے اخبارات میں صرف چند ایک ایسے ھیں جنھوں نے بالکل صحیح طور پر اپنی تحریروں میں 'نے' کا استعمال کیا ھے اور افعال کی تذکیر و تانیث کو پیش نظر رکھا ھے۔ انگریزی اخبارات کے تراجم میں نسبتاً زیادہ صفائی پائی جاتی ھے لیکن کبھی کبھی انگریزی طرز عبارت و قواعد کی تقلید کی جاتی ھے اور اردو محاورہ اور قواعد کی پابندی کا لحاظ نہیں کیا جاتا ھے۔ مثلاً ذیل کے جملے ایسے ھیں کہ اردو ان سے قطعاً نا آشنا ھے۔

"غدر کے بعد جو اشتہار ملکہ عالیہ سے اصدار پایا"۔

"جو کچھ کارروائی صاحبان ترک سے ظہور میں آئے گی......"۔

انگریزی الفاظ ایک دوسرے کی طرف مضاف ھوں یا عربی اور فارسی الفاظ انگریزی الفاظ کی طرف مضاف ھوں تو عموماً فارسی قواعد کے مطابق کسرۂ اضافت استعمال کیا جاتا ھے۔ عربی اور فارسی اخبارات کے ترجموں میں محاورات کا استعمال نسبتاً صحیح ھے البتہ مولویانہ طرز نگارش کا اثر صاف نمایاں ھے بلکہ بسا اوقات تحت اللفظ ترجمہ کیا جاتا ھے۔

علمی اور مذہبی مضامین میں محاورات اور اصطلاحات علمیہ کی اس قدر بھرمار ہوتی تھی کہ ان اخبارات کے پڑھنے والے شاید ہی سمجھتے ہوں ذیل میں ایک عبارت جریدہ روزگار (اشاعت جولائی ۱۸۷۸ ع) سے نقل کی جاتی ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ عبارت کو کس قدر ثقیل بنایا جاتا تھا۔ اس مضمون کا عنوان "آثار قیامت" ہے۔ دیکھنا عبارت میں کس کی پیچیدگی اور الفاظ میں کس درجہ کی ثقالت پائی جاتی ہے :-

"حالات زمانہ کے نظر کرتے قیامت قریب ہے اور لاریب شدنی ہے۔ لیکن فلاسفہ ناحق شناس اس کے منکر ہیں کہتے ہیں کہ اگر اس عالم کی طرح دوسرا عالم موجود ہووے بیشک کروی الشکل ہوگا اور دو کروں کا متماثل التصاق اور انطباق بغیر اس کے دونوں میں فرجہ واقع ہووے ممکن نہیں پس درصورت وقوع فرجہ خلا لازم آوے گا وہ محال ہے حالانکہ یہ استدلال مغالطہ محض ہے اس واسطے کہ اولاً خلا کا استحالہ ممنوع ور اس کے سائر براہین بجائے خود مقدوح اور ثانیاً یہ کہ عالم بہ تمامہ کروی ہووے ہندسے کے دلائل صرف افلاک متحرکہ کے رویت پر قایم ہیں......"

اور آگے چل کر مضمون نگار یوں گہر افشاں ہوتے ہیں :-

"آثار قیامت دو ہیں ایک صغری دوسرے کبریٰ۔ آثار صغریٰ امور مامورہ میں فتور اور فجور منہیہ کے ظہور پانے، علم دینی کا گھٹنا، علم دنیا کا بڑھنا، مذاہب باطلہ کا رواج پانا احادیث اور اخبار کاذبہ سنانی، اراذل کا صاحب شوکت اور اسافل کا اھل خدمت ہونا........"

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد میں مولویوں کی گفتگو اور تحریر کی جو ہجو کی ہے وہ غالباً اسی قسم کی عبارتوں پر مبنی ہے!

اسی دور کے اخبارات میں مدراس کا ہفتہ وار اخبار مظہرالعجائب بھی شامل ہے۔ یہ ۱۸۷۹ع میں جاری ہوا۔ یہ عبارت اور ترتیب کے لحاظ سے ان تمام اخبارات سے کسی قدر مختلف ہے جن کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ یہ مدراس کی مشہور مسجد والاجاہی کے احاطے میں مطبع مظہرالعجائب سے شایع ہوتا تھا۔ غالباً غدر دھلی کے کچھ دنوں بعد ھی یہ مطبع قائم ہوا۔ اس مطبع کی اردو، فارسی اور عربی مطبوعات کی فہرست ان میں بعض نہایت ھی کارآمد کتابیں پائی جاتی ہیں - ۱۸۶۱ء میں میر مہدی واصف

کا مشہور اردو لغت "دلیل ساطع" اسی مطبع میں طبع ہوا اور واصف کا تذکرۂ علمائے مدراس عربی زبان میں ۱۸۷۷ء میں یہیں سے شایع ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مدراس کے بعض علما اور شعرا اس مطبع کے منتظمین اور کارکن تھے اور اسی وجہ سے یہاں کی طباعت میں صحت و صفائی پائی جاتی ہے۔ ۱۸۷۹ء میں ممالک محروسۂ سرکار عالی میں جریدہ روزگار کے قبول عام نے اس مطبع کے منتظمین کو اس امر پر متوجہ کیا کہ وہ بھی ایک اخبار اس کی ریس میں نکالیں اور مملکت آصفیہ کی خبروں کی اشاعت سے اپنے اخبار کی قدر و قیمت میں اضافہ کریں۔ بہت ممکن ہے کہ ابتدائی ایام میں عہدہ‌داران حیدرآباد سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی نہ کسی قسم کی امداد جاری رہی ہو۔ یہ اخبار پیسہ اخبار کی تقطیع پر بارہ صفحات کا تھا۔ سرورق پر مسجد والاجاہی کی تصویر تھی اور اس کے ذیل میں بیل بوٹوں میں اس اخبار کا نام ہوتا تھا۔ مسجد والاجاہی کی تصویر کے نیچے یہ شعر ہوا کرتا تھا:

الٰہی نغمہ سنجی بخش چون بلبل زبانم را برنگ گل بہار آرائی محفل کن بیانم را

یہ بھی اخبار "جریدہ روزگار" کی نقل تھی کیونکہ اس کے سرورق پر میر غلام علی آزاد کا یہ شعر درج ہوا کرتا تھا:

برآر از مد بسم‌اللہ تیغ خوشمقالی را مسخر کن سواد اعظم نازک خیالی را

اخبار مظہرالعجائب کی اجرا کا قطعۂ تاریخی اور ہر سال کا جدید قطعۂ تاریخ علی‌العموم ہر اشاعت کے ساتھ شایع ہوتے تھے۔ اس اخبار کی عنان ادارت مولوی ابوالمحامد سلطان محمود صاحب حنفی متخلص بہ "حمد" کے سپرد تھی۔ مقاصد اخبار کے ذیل میں اخبار کی پالیسی کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی تھی:-

"سوائے واقعات واقعی و مضامین علمی کے اور کوئی امر غیر واجبی دور از تہذیب درج اخبار نہ ہوگا۔ اکثر اوقات ابواب دینی بھی مرقوم ہوا کریں گے۔ مدح و ذم غیرواجبی سے کام نہیں تو تو میں میں کا نام نہیں"۔

آخری جملہ میں ممکن ہے جریدۂ روزگار پر حملہ ہو کیونکہ یہ اخبار کبھی کبھی حیدرآباد کے بعض افسروں پر ناواجب نکتہ‌چینی سے نہیں چوکتا تھا۔

مظہرالعجائب مصطفےٰ حسین صاحب کے زیر اہتمام ہر پنجشنبہ کو وقت پر شایع ہوتا

تھا عموماً اس کی ہر اشاعت میں دو تین صفحے اشتہارات کے لیے وقف ہوا کرتے تھے۔ اشتہارات اکثر ھالہ ے صاحب کی ادویہ اور دہلی اور بنارس کے اطبا کی مقوی دواؤں سے متعلق رہا کرتے تھے۔ اخبار کی کتابت مدراس کے مشہور کاتب محمد جمال الدین اعجاز کیا کرتے تھے۔ اس کی ہر اشاعت میں پہلے صفحے پر ہفتہ آئندہ کی جنتری ہوتی تھی جس میں طلوع و استواء و غروب آفتاب کے اوقات اور مشاہیر کی وفات اور اعراس کی تاریخیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی اس کے نیچے بعض فتاوے بہ صورت سوال و جواب درج کیے جاتے تھے۔ شعر و سخن کے لیے بھی ایک یا دو کالم مخصوص تھے۔ ایڈیٹوریل کے علاوہ «انتخابات تار برقیات»، «انتخابات اخبارات انگریزی» «انتخابات اخبارات اردو» اور «مضامین و اخبار نامہ نگاران» کے مستقل عنوان اس اخبار میں پائے جاتے ہیں۔

فروری ۱۸۸۴ع کی دو اشاعتوں کے مطالعہ سے مدراس کی مذہبی ہلچل کے متعلق بعض نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ پادری گولڈ اسمتھ جن کا انتقال اسی سال (اکتوبر ۱۹۴۰) ہوا ہے مدراس کے مشہور مشنری تھے اور انھوں نے جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے ایک مدرسہ مسلمان طلبہ کے لیے ہارس ہائی اسکول کے نام سے یہاں جاری کیا تھا۔ مسلمانوں میں تبلیغ مسیحیت کی کوششوں میں یہ دن رات مصروف رہا کرتے تھے۔ انھوں نے یوسف حامد نامی کسی شخص کو کرسٹان بنایا تھا اور اس کے نام سے ایک رسالہ اردو میں شایع کیا تھا جس میں اسلام پر اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ناواجب حملے تھے۔ یہ کتاب مدراس کے کسی مطبع میں طبع ہوکر شایع ہوئی اور اس سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس لگی۔ مسلمانوں کو سب سے بڑا صدمہ اس امر پر ہوا کہ اس رسالے کے کاتب اور طابع مسلمان تھے۔ اس واقعہ پر شہر میں عام ناراضی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مدیر مظہر العجائب نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور یہ تجویز پیش کی کہ علما کی تنظیم کے لیے ایک باقاعدہ انجمن بنائی جائے۔ چنانچہ ان کی تحریک پر ایک مجلس بنام «مجلس علمائے اسلام» منعقد کی گئی۔ مظہر العجائب کے ایڈیٹر اور مولانا محمود صاحب مرحوم فرزند قاضی الملک کی دستخطوں سے دعوتی رقعے تقسیم کیے گئے۔ اور احاطۂ مسجد والا جاہی میں علمائے مدراس کا پہلا شاندار جلسہ ۵ فروری ۱۸۸۴ع کو منعقد ہوا۔ میر مجلس مدراس کے نامور عالم

مولوی طرازش خان بہادر منتخب ہوئے اور بالاتفاق مدیر مظہرالعجائب کو "کارفرمائے مجلس علمائے اسلام" مقرر کیا گیا۔ اس کے اہم مقاصد یہ تھے کہ مسلمانوں کی اصلاح کی جائے اور ان کو خلاف شرع حرکتوں سے باز رکھا جائے اور غیر مسلموں کے اعتراضات اور حملوں کے جواب دیے جائیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلا جلسہ بہت ہی کامیاب رہا۔ جلسہ میں مولوی شاہ محمد صادق صاحب شریف مدیر طلسم حیرت نے اعلان کیا کہ وہ آئندہ مشنریوں کی تعلیم سے احتراز کریں گے اور اس بنا پر انھوں نے ھارس ھائی اسکول کی مدرسی سے استعفا دے دیا۔ اس کے بعد کی اشاعتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یوسف حامد کے رسالہ کی کتابت اور طباعت میں حصہ لینے والوں نے اپنے ارتداد کا اقرار کیا اور تجدید ایمان کا اعلان کیا۔ اس ھلچل کی بہ دولت بہت سے مسلمان طلبہ اسکول سے علیحدہ ہونے لگے۔ منتظمین مدرسہ کو فوراً ہی ایک اعلان شایع کرنا پڑا جس میں ھیڈ ماسٹر اور پادری گولڈ اسمتھ نے اس امر کا عہد کیا کہ آئندہ مسلمان طلبہ سے دوران تعلیم میں کسی قسم کا مذہبی مباحثہ نہ کیا جائےگا اور نہ اسلام کے خلاف کسی قسم کے خیالات ظاہر کیے جائیں گے۔ انجمن علما کی یہ کامیاب کوشش بارآور ثابت ہوئی اور مشنریوں کو مدراس کے مسلمانوں میں تبلیغ مسیحیت سے سخت مایوس ہونا پڑا۔

مظہرالعجائب کی مابہ‌الامتیاز خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ہر قسم کے مذاق والوں کے لیے مضامین، خبریں اور دلچسپ انتخابات مہیا کیے جاتے تھے۔ اس کے مدیر مولوی سلطان محمود صاحب مدراس کے مشہور عالم مولوی غلام قادر صاحب مصنّف صراط‌الاسلام و صراط‌النجات کے فرزند تھے۔ یہ ایک لائق عالم اور مشہور واعظ تھے۔ شعر و شاعری سے بھی انھیں خاصی دلچسپی تھی اس لیے ان کے اخبار میں مذہبی اور ادبی پہلو خاص طور پر نمایاں ہیں۔ ان کے شریک کار مولوی زکی‌الدین احمد بھی اردو کے اچھے ادیب اور شاعر سمجھے جاتے تھے۔ اخبار کے نائب مدیر کی حیثیت سے یہ اپنے فرائض انجام دینے کے علاوہ مستقل طور پر ۱۸۸۴ع سے تحفہ نامی ایک ادبی رسالہ مہینہ میں دو بار شایع کیا کرتے تھے۔ اس کی ترتیب کا اندازہ ذیل کی عبارت سے ہوسکتا ہے:-

« یہ عمدہ رسالہ علوم و فنون کی روشنی کا مخزن، مباحث علمی کا معدن، دینی ابواب کا مظہر، دنیوی ابواب کا مدبر، حالات سلف صالحین و حکمائے عاقلین کا مورخ، شعرائے نامدار اور سخنوران گرامی کا تذکرہ خواں، عمدہ عمدہ مضامین سے دلوں کو روشن کرنے والا، حالات تمدن اور حسن معاشرت سے رعایا کو اور رعایا کی فریاد سے حکام کو اطلاع دینے والا، پولٹیکل معاملات کا واقف کار، قیصر کا خیرخواہ اور خلایق کا معاون، حضرات مذاق پسندوں کے حسب خاطر مضامین علمی، شعر و سخن، اخبارات دینیات و دنیوی معاملات و دلچسپ حکایات وغیرہ سے مرکب ایک عمدہ ارگجہ تیار کرکے خاص و عام کے خدمات میں تحفہ ارسال ہوتا ہے"۔

غالباً اسی ترتیب کو ہفتہوار اخبار مظہرالعجائب میں بھی ملحوظ رکھا گیا تھا لیکن باوجود اس کے اس اخبار کو شمس‌الاخبار اور جریدۂ روزگار کی سی مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔

اردو اخبارات کے متعلق یہ کہنا بےجا نہیں ہے کہ «ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے ان کی رونق» اور اس معیار سے ۱۸۵۸ء سے ۱۸۷۸ء تک ہندستان اور بیرون ہند میں کئی ایک ایسے ہنگامے پیش آئے کہ مسلمانوں کو ان سے براہ راست تعلق تھا اور اس لیے اس بست سالہ مدت میں کافی اخبار مدراس سے جاری ہوئے اور روز افزوں ترقی کرتے رہے۔ لیکن ۸۰ء کے بعد ایسے ہنگامہ‌خیز مواقع بہت کم پیش آئے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ۸۰ء سے بعد شایع ہونے والے اخبارات زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکے اور میدان مقابلہ میں یہ جدید اخبارات پرانے احبارات کے مقابلے کی تاب نہ لاسکے۔ ذیل میں ان اخبارات کے نام دیے جاتے ہیں جو ۸۰ء سے ۹۰ء تک شایع ہوئے۔ ان میں سے اکثر ایک سال یا دو سال کے عرصے میں بند ہوگئے۔ ان کی اشاعت بھی غالباً محدود تھی اس لیے ان کے نمبر بھی نہیں ملتے۔ مصر و سودان کے معاملات اور مہدی سوڈانی اور خرطوم کی جنگ کے واقعات مسلمانان ہند کے لیے جاذب نظر تھے لیکن امن کے زمانے میں اکثر اخبارات نے بہی مناسب سمجھا کہ ہنگامے پیدا کیے جائیں چنانچہ انیسویں صدی کے آخری دور میں اخبارات کی جلدوں کو دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے

۱ اختر شاهنشاهی

کہ معاصرانہ چشمک، جا و بےجا مدح و ذم، عیب جوئی اور نکتہ چینی اور ناروا حملے وغیرہ ہی وہ وسایل تھے جن کے ذریعہ سے ان کی اشاعت کو بڑھایا جاسکتا تھا۔ مدراس کے اخبارات کے لیے اس سلسلے میں دلچسپ مشغلہ یہ تھا کہ حیدرآباد کے اندرونی معاملات میں رائےزنی کی جائے۔ جریدۂ روزگار کو اس سلسلے میں یہ کامیابی حاصل ہوئی تھی کہ حکومت کی جانب سے غالباً ایک‌سو روپیہ کا ماہانہ وظیفہ جاری ہوا تھا اور اس کے علاوہ کافی تعداد میں خریدار مملکت آصفیہ سے مل گئے تھے۔ اس غیر متوقع کامیابی نے مدراس کے دیگر اخبارات کو اس امر پر مجبور کیا کہ وہ بھی جریدۂ روزگار کی تقلید کریں چنانچہ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کے مدراس سے کئی ایک اخبار جاری ہوئے لیکن انھیں خاطرخواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور بہت ممکن ہے کہ انھیں بہ صد حسرت و یاس یہ کہنا پڑا ہو:-

در محفلے کہ یاراں شرب مدام کردند چوں نوبتے بما شد آتش بجام کردند

۱۸۸۱ء میں حکیم موسیٰ رضا صاحب کے فرزند حکیم محمد حسین صاحب نے ایک اخبار احسن‌الجرائد کے نام سے جاری کیا۔ مدراس میں اخبارات کی کثرت نے اب مختلف گروہ اور جماعتیں پیدا کر دی تھیں۔ ہر ایک اخبار کے حمایتی دوسرے اخبار کو بالخصوص جدید اخبار کو حسد کی نظر سے دیکھا کرتے اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی نئے اخبار کو فروغ حاصل ہو اور اس کی بدولت ان کی اشاعت کو صدمہ پہنچے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ آپس میں چھیڑ چھاڑ نہایت معمولی بات تھی۔ احسن الجرائد کے مخالفین نے ذرا سی تصحیف کے بعد اس کا نام اخس‌الجرائد رکھا اور یہ پھبتی کچھ ایسی پھب گئی کہ اخبار کے بند ہونے کے ایک مدت بعد تک یہ نام عام طور پر مشہور رہا۔ حکیم محمد حسین صاحب فارسی اور اردو میں اچھی قابلیت رکھتے تھے، شعر و شاعری کا اچھا ذوق تھا۔ ان کی سرپرستی میں ایک انجمن بنام انجمن شعرا قائم کی گئی تھی جس کے سکرٹری میر صادق‌حسین صاحب تھے۔ ۱۸۸۴ء میں احسن‌الجرائد کے ساتھ انھوں نے حدیقۂ شعرا نامی ایک گلدستہ بہ طور ضمیمہ اخبار جاری کیا۔ یہ ہفتہ‌وار اخبار تھا اور ہر پنجشنبہ کو مطبع اعجاز محمدی میں طبع ہوکر ترملکھیری ہائی روڈ مکان نمبر ۹ سے شایع ہوا کرتا تھا۔ اس اخبار کی تاریخ اجرا سے دو سال بعد ایک اور اخبار بہ‌نام "حاکم" مطبع انوری سے شایع ہونے لگا

یہ بڑی تقطیع کے صرف ایک ورق پر ہفتہوار طبع ہوتا تھا۔ اس کے مالک و مہتمم محمد انو صاحب مالک مطبع انوری تھے۔ غالباً یہ اخبار بہت جلد بند ہوگیا اس واسطے اس کے حوالے کسی اخبار میں نہیں پائے جاتے۔

۱۸۸۴ع میں مدراس سے کئی نئے اخبار جاری ہوئے۔ ان میں سے بعض صرف چند مہینوں کے بعد ہی بند ہوگئے۔ جنوری ۱۸۸۴ع میں محلۂ ترملکھیڑی میں ایک مجلس انجمن احباب کے نام سے قائم ہوئی تھی جس کے سکرٹری عبدالوہاب صاحب تھے۔ ان کی سعی و کوشش سے انجمن کی جانب سے «اتحاد» نامی ہفتہوار اخبار نکلنے لگا۔ اس کے ایڈیٹر غلام غوث صاحبؔ غالباً مطبع اتحاد کے مہتمم بھی تھے۔ اخبار کے مقاصد اور پالیسی کو ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے :—

" تمامی خلایق پر فواید و نتائج اتحاد کو ظاہر کردےگا۔ یہ اخبار خصوص ترقی اسلام و خیرخواہی جمیع کافہ انام میں مصروف رہےگا اور رعایا کی فریادی گورنمنٹ کے گوش گزار کرےگا اور گورنمنٹ کے احکامات رعایا پر ظاہر کرےگا اور گورنمنٹ کے درمیان سلسلہ اتحاد کا باقی رکھےگا اور عناد کا بیخ کن ہوگا اور اپنے ملک اور دیگر ممالک کے سچے اور عبرت انگیز واقعات سنائےگا اور ہر ملک کی اشیا کے نرخ مشتہر کرےگا جس سے تجارت کو بہت ترقی حاصل ہو اور ہر ایک امر میں اپنی رائے آزادانہ ظاہر کرنے میں کوتاہی نہ کرےگا[۱]۔

یہ اخبار جس محلے سے نکلتا تھا اسی محلے سے ایک اور اخبار اسی نام کا انجمن اسلامیہ کی سرپرستی میں چار پانچ مہینوں کے بعد جاری ہوا اور دونوں اخبار کچھ دنوں تک برابر نکلتے رہے[۲]۔

ہم نے ابھی اوپر بیان کیا ہے کہ اخبارات کی کثرت نے اختلافات بڑھا دیے تھے۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ اس دور کے اخبارات نے جس قسم کے نام اپنے لیے منتخب کیے ہیں ان میں خود ان کے مقاصد کی جھلک پائی جاتی ہے چنانچہ اتحاد کی اشاعت کے بعد ہی ایک اور اخبار اتفاق کے نام سے جاری ہوا۔ یہ ابتدا میں ہفتہ میں دوبار شایع ہوتا تھا لیکن ۱۸۸۵ع میں اس کو روزانہ کردیا گیا۔ غالباً یہی مدراس کا سب سے پہلا روزانہ اردو اخبار ہے۔ اس اخبار کو انجمن اسلامیہ کے علاوہ امرائے مدراس کی سرپرستی

---

۱ اختر شاہنشاہی ۲ اختر شاہنشاہی

بھی حاصل تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس کے منتظمین نے مصارف کے بارگراں کو سنبھال لیا۔ آنریبل میر ہمایوں جاہ بہادر سی۔ایس۔آئی انجمن اسلامیہ کے صدر تھے اور مدراس کے مسلمانوں کی قومی اور سیاسی تحریکات میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ سالانہ اجلاس انڈین نیشنل کانگریس منعقدہ کراچی ۱۹۱۳ ع کے صدر نواب سید محمد بہادر ان کے فرزند ارجمند تھے۔ نواب میر ہمایوں جاہ کے ہم نشینوں میں بڑی قومی ہمدردی رکھنے والوں کی خاصی تعداد تھی چنانچہ نواب صاحب کی تحریک پر جناب احمد محی الدین خان صاحب سکرٹری انجمن اسلامیہ نے اردو اخبار کے علاوہ مسلمانوں کے لیے ایک انگریزی اخبار کی ضرورت کو اچھی طرح سے محسوس کیا اور عہدہ داران انجمن کی تائید سے ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار " محمڈن " کے نام سے جاری کیا جو کچھ مدت کے بعد نصیرالدین صاحب گھٹالہ مدیر شمس الاخبار کے سپرد کیا گیا اور ایک مدت مدید تک یہ شمس الاخبار کے دوش بدوش نکلتا رہا۔

۱۸۸۴ ع کی ابتدا میں سید حسن رضا صاحب آتش نے ایک اخبار " دبیر مدراس " کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ سید حسن رضا صاحب پہلے پہل مدرسۂ اعظم میں استاد تھے اور اس کے بعد کچھ دنوں تک سرکاری ملازمت میں مہتمم مدارس کے عہدے پر فائز رہے۔ ان کی فارسی قابلیت مسلّم الثبوت تھی۔ انھوں نے جنوری ۱۸۸۴ ع میں محلہ رانی پیٹھ میں مطبع حسنی کے نام سے ایک جدید مطبع قایم کیا۔ اسی مطبع میں ہفتہ وار دبیر مدراس بڑی تقطیع کے بارہ صفحات پر شایع ہوتا تھا۔ دو تین مہینے کے بعد منشی محی الدین خان صاحب " تسنیم " نے یہیں سے " کرناٹک پنچ " جاری کیا مدراس سے نکلنے والے اخباروں میں طلسم حیرت کے بعد یہ دوسرا ظریف پرچہ ہے جو عشرہ وار بہ طور ضمیمہ دبیر مدراس شایع ہوا کرتا تھا۔ ابھی ایک سال بھی پورا نہ ہونے پایا تھا کہ منشی محی الدین خان صاحب " تسنیم " نے مطبع حسنی سے غالباً قطع تعلق کرلیا اور مرزا قاسم بیگ کے مطبع ہدایت سے ایک اخبار دبیر ہند کے نام سے جاری کیا۔ جنوری ۱۸۸۵ [۱] یہیں بہ طور ضمیمہ دبیر ہند ایک ہفتہ وار ظریفانہ نکالا جو " دکن پنچ " کے نام سے مشہور تھا [۱]۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں قیام مطابع و اجرائے اخبار کو ایک نہایت سہل کام سمجھا گیا تھا۔ جس بے سر و سامانی سے اخبار جاری ہوتے تھے

۱ اختر شہنشاہی

اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ تاریخ اشاعت کے چند روز بعد ہی یہ بند ہو جایا کرتے تھے -
ابتدائے اشاعت میں ان کے لیے چند خریدار اور ہمدرد و معاون پیدا ہوجاتے تھے لیکن
کچھ دنوں کے بعد ان کی سہل انگاری اور منتظمین اخبار کی بے توجہی کی بہ دولت اخبار
کی زندگی خطرے میں پڑجاتی تھی -

اپریل ۱۸۸۵ ع میں مطبع گلزار بنگلور سے محمد ابراہیم صاحب طپش کے
زیر اہتمام اخبار "باد صبا" نکلنے لگا - یہ تقریباً پندرہ سولہ سال تک کامیابی کے ساتھ
جاری رہا - اپنی اشاعت کے دوران میں کچھ مدت کے لیے یہ ہفتہ میں چار دفعہ شائع
ہوا کرتا تھا - طپش صاحب کی وفات کے بعد ان کے فرزند محمد اسماعیل نے اس کو جاری
رکھا - آخری زمانے میں یہ شاید ہفتہ وار کردیا گیا تھا - بنگلور سے اس اخبار کے علاوہ
ایک اور اخبار "بنگلور اخبار" کے نام سے ہفتہ میں دوبار شایع ہوتا رہا - ۱۸۸۶ ع میں
ارکاٹ (محمد پور) کے مطبع شوکت الاسلام سے شاہ عزیزالدین صاحب کھٹالہ نے ایک
اخبار عزیزالاخبار کے نام سے جاری کیا لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، شاہ صاحب
اپنے بعض خیالات کی وجہ سے بدنام ہو چکے تھے، اس لیے اس اخبار کو فروغ
حاصل نہ ہوسکا -

انیسویں صدی کے آخری دس سال میں چار اردو اخبار مدراس سے شایع ہوئے -
۱۸۹۴ع میں مولوی نوراللہ حسین صاحب کے زیر ادارت اخبار "الحامی" نکلنے لگا -
مولوی صاحب موصوف بلہاری (ضلع مدراس) کے مدرسۂ عربیہ کے فارغ التحصیل مستعد
عالم تھے - مدت تعلیم کے اختتام پر انھوں نے مدراس میں اقامت اختیار کی اور اخبار
نکالنے کی تجویز کی - یہ اخبار ہفتہ میں دو بار شایع ہوتا تھا - اسلامی ممالک کی خبروں
کے علاوہ دلچسپ علمی مضامین اور غزلیں درج اخبار ہوتی تھیں - اس کی چھٹی جلد
کے متفرق پرچوں کو دیکھنے سے پتا لگتا ہے کہ انھوں نے یہ التزام کر رکھا تھا کہ ایک
کالم میں "مذہبی امورات" اور ایک میں "مشاہیر اہل اسلام کی سوانح عمریاں" ایک
کالم میں "عام سوالات" یا "امور عامہ" اور ایک میں "مذاق" کے عنوان قایم کیے جائیں اور
ان کے ذیل میں مسلسل مضامین شایع ہوں - اس کے بعد مدراس اور اضلاع مدراس سے

متعلق خبریں ہوتی تھیں اور آخیر میں اسلامی خبروں کے عنوان سے ممالک اسلامیہ کی تازہ ترین خبریں مہیا کی جاتی تھیں۔ ہر مہینے کی آخری اشاعت میں مصرع طرح پر مختلف شعرائے مدراس و حیدرآباد کی غزلیں یا کبھی کبھی ان کے علاوہ ان کا غیر طرحی کلام بھی شایع ہوتا تھا۔ مجموعی حیثیت سے اس امر کی کوشش کی جاتی تھی کہ ہر قسم کے مذاق والوں کے لیے یہ اخبار دلچسپ ثابت ہو۔ چنانچہ مدراس میں اردو اخباروں کی ہردل عزیزی میں نمایاں طور پر کمی ہونے کے باوجود یہ اخبار سات آٹھ سال تک کامیابی سے نکلتا رہا۔

«الحامی» کو نکلے ہوئے ابھی ایک سال بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ ایک اور اخبار بنام «مخبر دکن» مدراس سے نکلنے لگا۔ یہ اپنی اشاعت اور شہرت کے لحاظ سے اپنے پیش‌رو اخبارات سے پیچھے نہ تھا۔ ۱۸۹۵ع میں سید عبدالقادر صاحب نے اس کو جاری کیا۔ یہ بارہ صفحوں پر مطبع سلطانی رانی پیٹھ میں ہفتہ وار چھپ کر شایع ہوتا تھا۔ اردو عبارت اور طرز تحریر کے لحاظ سے یہ اخبار مدراس کے اکثر اخبارات پر فوقیت لے جاتا ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں بہت سے قابل حضرات تھے۔ ان میں منشی محی الدین حسین صاحب اور سید علی قادری صاحب بہار تلمیذ شریف مدراسی و داغ دہلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اخبار کا اکثر حصہ ان حضرات کے قلم کا رہین منت رہا کرتا تھا۔ بہار ضلع نیلور کے مردم خیز قصبۂ اودگیر کے رہنے والے تھے۔ فارسی اور اردو کے اچھے عالم تھے۔ شاعری کا خاصا ذوق تھا۔ ۱۸۸۷ع میں انھوں نے مدراس سے ایک ماہوار رسالہ «جلوۂ سخن» کے نام سے نکالنا شروع کیا تھا۔ اس میں علاوہ مختلف مضامین کے مدراس یونیورسٹی کے امتحانات کی فارسی کتابوں پر نوٹس اور ان کے مشکل مقامات کے حل موجود ہوتے تھے۔ بہار صاحب یہاں کے ایک کہنہ مشق ادیب تھے۔ «مخبر دکن» کی اشاعت کے بعد مستقل طور پر ان کی خدمات حاصل کرلی گئی تھیں اور بعد میں ایک معقول مشاہرہ پر انھیں حیدرآباد روانہ کیا گیا تھا، وہ وہیں سے مملکت آصفیہ کے متعلق خبریں اور مضامین مہیا کرکے اخبار کے لیے روانہ کرتے تھے۔ جریدۂ روزگار سے اس اخبار کی معاصرانہ چشمک تھی۔ عموماً یہ اخبار حیدرآباد کے معاملات

پر سختی سے نکتہ چینی کیا کرتا تھا - حیدر آباد میں شمالی ہند کے اصحاب کے اثر و نفوذ سے یہ اخبار ہمیشہ بیزاری کا اظہار کیا کرتا تھا بلکہ اس سلسلہ میں اس نے کچھ اس طرح کا پروپگنڈا کیا کہ یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ ملکی اور غیرملکی کے جھگڑوں کو اس اخبار کی وجہ سے بہت کچھ فروغ حاصل ہوا - اس کی پہلی جلد کے مطالعہ سے حیدرآباد کے اندرونی معاملات اور مالی نظم و نسق پر کافی روشنی پڑتی ہے - اعلیٰحضرت مرحوم کی پیشی کے سکرٹری نواب سرور جنگ کے خلاف اس اخبار نے مسلسل مقالے لکھے - «ایوننگ میل» بنگلور بھی غالباً نواب سرور جنگ کی پالیسی سے نالاں تھا اس لیے جابجا «مخبر دکن» میں اس کے حوالے اور اقتباسات پائے جاتے ہیں -

اس کے پہلے نمبر میں اخبار کی ضرورت اور اس کے فوائد پر بہ عنوان «ہم اور اپنا اخبار» ایک مفید مقالہ ہے جس میں سے ذیل کا اقتباس مدراس میں اردو اخباروں کی بےقدری پر شاہد ہے :—

«......مگر ہماری قوم کے مذاق کی، افسوس! یہ کیفیت ہے کہ اخباروں کی طرف ان کے عظیم‌الفوائد اور کثیرالمنافع ہونے کے باوصف ایک سرمو التفات نہیں؛ ان کے مطالعہ کا حاشا شوق نہیں - قدردانی تو ایک طرف، مفت بھی ملیں تو تقویم پارینہ سے زیادہ رتبہ نہیں - یہی تو ایک بھاری وجہ ہے جو ہمیں گھر بیٹھے دنیا کے حالات سے ماہر ہونے اور ان سے پند و نصیحت لینے کا موقع نہیں ملتا ہے - جب ہمیں اخبار ناموں کے مطالعہ کا شوق نہیں تو جن فوائد کو ہم ابھی بیان کر آئے ہیں اور جن سے ساری مہذب قومیں فائدہ اٹھا رہی ہیں ان سے ہم کیونکر متمتع ہوسکیں گے اور اقوام کی ترقی اور اپنے تنزل کا نقشہ ہماری آنکھوں میں کس طرح بیٹھ سکےگا؟»

اس عبارت میں علامات وقف کا استعمال اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ مضامین نہایت احتیاط سے لکھے جاتے تھے - اس کے ادارتی مقالے طویل اور پرمغز ہوا کرتے تھے - ذیل میں پہلی ششماہی کے مقالات کے عنوان درج کرتے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوگا کہ ان میں سے اکثر مضامین حیدرآباد سے متعلق ہوا کرتے تھے :—

(۱) رزیڈنٹ اور حیدرآباد کے ملکی امور (۲) سر ولیم ہنٹر اور مسلمانان ہند (۳) ونیلاک اسکالرشپ (۴) ریاست حیدرآباد کی بدنظمی (۵) آرمینیہ کے ادعائی مظالم (۶) ٹون ہال لورپول میں شہزادہ نصراللہ خاں کی تقریب ضیافت میں قرأت قرآنی اور غضبیلے متعصبانہ عیسائیوں کی تعریض (۷) حجاج کے جہازوں کا مسودہ قانون (۸) ریاست حیدرآباد دکن اور اس کے بےجا مصارف (۹) قابل توجہ پیشی سکرٹری نواب سرور جنگ بہادر (۱۰) عیسائیوں کا پھر مسلمانوں پر سخت ظلم (۱۱) قرآن مجید کا ترجمہ (۱۲) شہزادہ نصراللہ خاں کے سفر کے مصارف (۱۳) حضور عالیہ نواب بیگم صاحبہ کرناٹک (۱۴) مسئلہ آرمینیہ پر پھر ایک سرسری نظر (۱۵) اردو فارسی مترجم گورنمنٹ مدراس (۱۶) ہم اور پھر جریدۂ روزگار (۱۷) جدید شریف مدراس کا تقرر (۱۸) ایک قابل تقلید فیاضی (۱۹) عیسائیوں کے ظلم و تعدی کا نمونہ (۲۰) لیجسلیٹو کونسل کے لیے مسلمان رکن (۲۱) مسئلۂ ٹرکی۔

حیدرآباد کے متعلق بعض مقالات مسلسل دو دو تین نمبروں میں شایع کیے گئے ھیں۔ ان کے علاوہ اس اخبار کی ہر اشاعت میں ممالک محروسۂ سرکار عالی کی بعض بد انتظامیوں کے متعلق دو ایک مضمون مراسلات کی تحت میں یا بسا اوقات سب ایڈیٹوریل کی حیثیت سے لازمی طور پر پائے جاتے ھیں۔ 'ہم اور پھر جریدۂ روزگار' کے عنوان سے اس اخبار نے جو ایڈیٹوریل شایع کیا ھے اس کے اقتباسات ذیل سے اندازہ ہوگا کہ اس اخبار کی پالیسی حیدرآباد کے متعلق کیا تھی:-

> " ھمیں سخت تعجب ھے کہ ھمارے ھمعصر نے عمر بھر اڈیٹری کی لیکن اڈیٹر کے فرائض اور اخبار کی اغراض و مقاصد سے انھیں اب تک خبر ھی نہیں ھوئی۔ " چندین مدت خدائی کردی ھنوز گاو خر را نشناختی " کی مثل ان پر پوری صادق آتی ھے۔ اڈیٹری اس کا نام نہیں کہ جھوٹی خوشامد کی جائے اور بےجا تعریفوں کے پل باندھے جائیں جیسا کہ اخبار جریدۂ روزگار کا مشرب ھے، ھمارا بدخواہ سلطنت بننا صاحب جریدہ نے صرف اس بنا پر ٹھہرایا ھے کہ ہم نے چند عہدہ داران سرکار نظام (خلد اللہ ملکہ و دولتہ) کی بعض بےجا کارروائیوں اور خود غرضانہ کاموں پر اعتراض کیا ھے، ذرا کوئی

اس پیرمغاں سے پوچھیے کہ آپ کا ارشاد یورپ والوں کی نسبت کیا ہوتا ہے کیونکہ یہی شغل ان کے رگ و پے میں بھی ساری ہے اور یہی شوق انھیں دن رات لگا رہتا ہے - دیکھیے کوئی روز ایسا نہیں گزرتا ہے جب کہ کسی نہ کسی اڈیٹر نے کسی لارڈ یا ڈیوک کی کارروائی پر نکتہ چینی نہ کی ہو اور ان کے معائب کی تصویریں ملک کے روبہ رو کھینچ کر نہ رکھ دی ہوں - کوئی کمبخت دن ایسا نہیں بسر ہوتا ہے جب کہ لارڈ سالسبری یا لارڈ روزبری وغیرہ کے کاموں پر جرح و قدح نہیں ہوتا یا ان کو آڑے ہاتھوں نہیں لیا جاتا ہو ؛ لیکن انھیں کوئی یہ نہیں کہتا کہ یہ بد خواہ سلطنت ہیں اور بدنام کنندۂ والی ملک - بلکہ ان کے اعتراضوں پر نوٹس لیا جاتا ہے اور رغبت سے ان کی باتوں کو سنا جاتا ہے مگر ہمارے مخاطب ہمعصر کا یہ حال ہے کہ ہم کو بدخواہ سلطنت اسلامی و بدنام کنندۂ ملک آصفی بتاتے ہیں محض اس وجہ سے کہ اپنا فرض منصبی برابر ادا کیا چاہتے ہیں » [۱] -

جب تک مخبر دکن نکلتا رہا جریدۂ روزگار سے اس قسم کی معاصرانہ چشمک برابر جاری رہی - تیس پنتیس سال تک یہ اخبار جاری رہا اور یہ اسی وقت بند ہوا جب کہ اس کے اڈیٹر مولوی عبدالقادر صاحب نے وفات پائی -

مولوی سید علی صاحب بہار کے علاوہ اس اخبار کے مستقل مضمون نگاروں میں مدراس کے بعض اور قابل حضرات بھی تھے جن میں مولوی نظام الدین صاحب فخری، سلطان محمود صاحب اور حکیم محمد سعید صاحب چودھر قابل ذکر ہیں - موخرالذکر دونوں حضرات نے مخبردکن کی ابتدائے اشاعت میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا - یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندستان میں شیکاگو کی کانفرنس کی تقلید میں مختلف مذاہب کی کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز تھی - مخبر دکن نے ان دونوں حضرات کی تائید سے اس سلسلہ میں متعدد مقالے درج اخبار کیے - یہ دونوں حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کے معترف و مداح تھے اور اس وجہ سے اس اخبار نے بھی دفاع اسلام کے لیے مرزا صاحب کا نام پیش کیا -

---

۱ مخبر دکن جلد ۱ شمارہ ۳۱ مورخہ ۱۴ نومبر ۱۸۹۵ء -

اس سلسلہ میں مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی اور مولوی عبدالحق صاحب مصنف تفسیر حقانی کے متعلق بھی کئی ایک مضامین شایع ہوئے۔ سلطان محمود صاحب مدراس میں مرزا صاحب کے متبعین میں امتیازی درجہ رکھتے تھے۔ ایک مدت تک وہ استرخا و فالج میں مبتلا رہے لیکن باوجود ان عصبی امراض کے وہ اپنی زندگی کے آخریں لمحات تک قادیانیوں کی حمایت میں مدراس اور بنگلور کے متعدد اخبارات میں مضامین شایع کیا کرتے تھے۔

مخبر دکن کے اس دور کے مضمون نگاروں میں حکیم محمد سعید صاحب چودھر اب تک بقید حیات ہیں اور یہ مدراس میں قادیانی جماعت کے ممتاز فرد ہیں۔ ان کی متعدد نظمیں مخبر دکن کے صفحات میں شایع ہوا کرتی تھیں۔ اس اخبار کی ابتدائی جلدوں کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس میں وقتاً فوقتاً علمی ادبی اور تحقیقی مضامین بھی شایع کیے جاتے تھے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں بھی اس اخبار نے اپنے بلند معیار کو بالکل اسی طرح باقی رکھا۔

۱۸۹۸ع میں اسد الدین احمد منیجر مطبع آصفی نے حکیم محمد سعید صاحب چودھر کی نگرانی میں سولہ صفحہ کا ایک ہفتہوار اخبار نیّر آصفی کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ حکیم صاحب مدراس کے ان تجربہ‌کار طبیبوں میں سے ہیں جنھیں ڈاکٹری کے فن میں بھی خاصی مہارت حاصل ہے۔ ان کی کتابیں کلیات طب جدید اور تحقیقات ہیضہ وغیرہ چھپ کر شایع ہوچکی ہیں۔ فن طبابت کے علاوہ اردو فارسی ادب میں بھی ان کا نہایت ستھرا مذاق ہے، ان کا اخبار نیّر آصفی بہ‌لحاظ عبارت اور طرز تحریر کے مخبر دکن کے دوش بہ‌دوش تھا۔ جریدۂ روزگار اور مخبر دکن کی ریس میں اس اخبار نے بھی اپنے بیشتر صفحات حیدرآباد دکن کے واقعات کے لیے وقف کر رکھے تھے۔ تقریباً دس بارہ سال تک یہ اخبار پابندی سے شایع ہوتا رہا۔ عربی اور ترکی اخبارات کے تراجم بھی اس میں بہ‌کثرت شایع کیے جاتے تھے۔ بظاہر یہ قیاس غلط نہیں ہے کہ جناب سلطان محمود صاحب اور ان کے ہم خیال مضمون نگاروں کا مخبر دکن کے ارباب انتظام سے نباہ نہ ہوسکا ہوگا اور غالباً اس کی وجہ اختلاف عقائد تھی، چنانچہ نیّر آصفی کا اجرا اور اس کے

کالموں میں کہیں کہیں مخبر دکن پر دبی زبان سے اعتراض پائے جاتے ہیں ۔ مملکت آصفیہ سے متعلق اس اخبار کی پالیسی بہ نسبت مخبر دکن کے جریدۂ روزگار سے زیادہ ملتی جلتی تھی ۔ اس اخبار کی ابتدا کے متعلق اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں :-

«چونکہ ہمارا نیر آصفی جلسۂ سالگرۂ آفتاب سپہر آصفیہ سے خصوصیت خاص رکھتا ہے اور اس کا وجود پیوستہ موقعہ سالگرہ کے دن عالم شہود میں آیا ، جو واقفین سے پوشیدہ نہیں ہے لہذا اعلیٰحضرت کی مسرت انگیز سالگرہ سے ہم کو سب سے زیادہ دلچسپی ہے اور ہم کوشش کریں گے کہ ہم سے اس رسم ہمایوں کے متعلق کوئی اہم فروگذاشت نہ ہو اور جتنے بڑے بڑے جلسے اس تقریب میں ہوں ان کے ظہار سے ہم اپنے ناظرین کو مطلع کرکے رعایائے آصفیہ کی وفاداری و جاں‌نثاری اور اعلیٰ حضرت کی توجہات شاہانہ کی داد دیں اور ہم اپنے ایک اہم اور مسرت انگیز فریضہ سے سبکدوش ہوں ۱»۔

باوجود اس کے کہ عہدہ‌داران ریاست حیدرآباد کی رضاجوئی اس اخبار کے پیش نظر تھی اس کے کالموں میں بعض ایسے مضامین جس میں جائز تنقید کا پہلو نکلتا ہے ، پائے جاتے ہیں چنانچہ چونتیسویں سالگرہ کے سلسلہ میں اعلیٰحضرت مرحوم نے اخبارات کے اڈریس کے جواب میں جو تقریر فرمائی ہے اس کے متعلق یہ اخبار رقمطراز ہے :-

«لیکن ہم یہاں کمال ادب سے عرض پرداز ہیں کہ جو آزادی ریاست آصفی میں اخبار ناموں کو حاصل ہے وہ فی‌الحقیقت ایسی آزادی نہیں ہے جس کے وہ قانوناً اور انصافاً مستحق ہیں بلکہ وہ تو بدقسمتی سے سر فٹز پیاٹرک کے زمانہ رزیڈنسی میں نیست و نابود ہوگئی ۔ ہمیں تاسف ہے کہ حضور عالی نے اس آزادی کے نسبت کچھ ارشاد نہیں فرمایا ۔ لیکن ہمیں اعلیٰحضرت کے جواب کے پہلے فقروں سے یہ امید بنتی ہے کہ حضور عالی جائز آزادی اخبارات کو اپنے ممالک محروسہ میں بھی انھیں اصول پر مبنی سمجھتے ہیں جن پر وہ برٹش انڈیا میں قائم ہے ۔ اگر حضرت اقدس کا یہ خیال ہے تو چشم ما روشن دل ما شاد »۔

جہاں اس اخبار نے اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے وہیں ذیل کا فقرہ بھی نظر آتا ہے جس میں غالباً مخبر دکن کی طرف اشارہ ہے :-

---

۱ نیّر آصفی نمبر ۲۴ جلد ۲ مورخہ ۲۴ اگست ۱۸۹۹ ع ۔

« ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے بعض ہمعصر جو نفاق انگیز تحریروں میں خاص مذاق رکھتے ہیں حضور انور کی اس سنجیدہ اور باوقعت سرزنش سے متنبہ ہوکر اپنی رفتار کو درست کریں گے درحقیقت اخبار کا کام باہمی اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کا ہے نہ کہ افتراق و انفصال کا

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی»

سالگرہ کے جشن و انتظامات کے متعلق اس اخبار نے اپنی اُسی اشاعت میں ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے جس میں سے ذیل کی عبارت نقل کی جاتی ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں :-

'« کتبے بہت کم اور اکثر غیرموزوں تھے اس قسم کا مذاق ہنوز کمی پر ہے ' بہت جگہ شاہراہ اور دروازوں پر انگریزی میں دعائیہ جملے لکھے ہوئے تھے جو بعض اوقات مالکان مکان اور اکثر آئند و روندگاں کی علم و فہم سے خارج تھے۔ ڈپٹی‌کمشنر سمت بیدر کے دروازے پر یہ ذومعنی بیت دلچسپی سے دیکھی گئی:-

حضرت آصف کا عالم میں یہ فیض عام ہے ہے ولادت کی خوشی یاں دفتر انعام ہے

بعض جگہ عجیب بھونڈا شاعرانہ مذاق دکھلایا گیا ہے۔ شاید اہل مذاق ہی خوب سمجھیں۔ راجہ مرلی منوہر بہادر کے ایک پڑوسی اپنی کاپتھی شاعری میں سالگرہ کی خوشی یوں مناتے ہیں :-

مبارک گرہ ہو مبارک ہو سال مبارک ہو تخت شہ ذوالجلال

صفائی بلدہ کا کتبہ اگر بجائے نظم کے نثر میں ہوتا تو سالگرہ کے دن شاعری کا خون نہ ہوتا۔ ....راجہ مرلی منوہر کی ڈیوڑھی کے محاذی جو کتبہ نثر میں ہے وہ عام فہم سے خارج ہے اس کا درج کردینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا :- « سالگرہ بہ فرح شاہ نظام‌الملک »۔

اپنے موضوع سے خارج ہونے کے خوف کے باوجود بھی اس اخبار کی ایک اشاعت شمارہ ۳۷ جلد ۹ (مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۰۶ع) کا ایک طویل اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے

۱ ماخوذ از نیّر آصفی نمبر ۳۴ جلد ۲ مورخہ ۲۴ اگست ۱۸۹۹ع۔

محض اس لیے کہ ۱۹۰۶ء میں اس اخبار نے جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر تقریباً بیس سال کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی کی صورت میں جلوہ‌گر ہوئی - یہ اقتباس ایک کھلی چٹھی سے لیا گیا ہے جو مدارالمہام سرکارعالی کے نام ہے اور اس میں " سالارجنگ اعظم " کو خطاب کیا گیا ہے اور اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ " ریاستِ دکن کے متعلق چند ایسے قابل یادگار کام " کیے جائیں جو " عمدہ اور مفید خلائق " ہو سکتے ہوں :-

" البتہ اتنی بات ضرور کہوں گا کہ زمانۂ حال کے مدبرین و حکماء کا قول فیصل یہی ہے کہ اعلیٰ تعلیم ہی ترقیات ملک و قوم کا باعث ہے اور خصوصاً وہ تعلیم جو فنون و حرفت کے متعلق ہو -

اعلیٰ تعلیم سے یہ مراد نہیں کہ ولایت جا کر بی - اے یا بارسٹر ہو آئیں ! اور کوٹ اور پتلون پہننے اور میز پر شراب و کباب اڑانے کی بری لت سیکھ آئیں ! بلکہ علوم دینی و علوم مشرقی کے ساتھ فنون مغربی کو ملاکر ایک نئی طرز تعلیم کا آغاز کیا جائے جو ملکی ضرورتوں کو پورا کرسکے - ملکی یونیورسٹی قائم کی جائے اور جملہ فنون کی حیدرآباد ہی میں زبان اردو میں تعلیم دلائی جائے - اکثر کتب کے تراجم ہو چکے ہیں - بقیہ کی تکمیل سررشتہ علوم و فنون سرکار عالی سے کرانی چاہیے -

(۳) اپنے سررشتۂ تعلیم کی اصلاح و ترقی فرمائیں مثل ریاست بڑودہ کے یہاں بھی جبری تعلیم کا قانون جاری فرمائیے اورمذہبی تعلیم کا پرچہ مسلمانوں اور ہنود کے لیے امتحان مڈل میں لازمی قرار دے دیا جائے تاکہ ابتدائی جماعتوں میں پابندی کے ساتھ کام چلے اور ملک کی اخلاقی حالت جو بہت کچھ خراب ہوچکی ہے سنبھل جائے اور رفتہ رفتہ درست ہوجائے -

(۴) جیساکہ سرکار نے وعدہ فرمایا ہے (بوقت دورۂ اندور) ہر ضلع میں ایک ایک صنعتی و تجارتی اسکول قائم کرکے ملک کی مردہ صنعت کو از سرنو تازہ فرمائیں -

اور بلدہ کے تمام مدراس فنون کو ترقی دے کر کالج بنا دیں اور ان میں زبان اردو میں تعلیم دلائی جائے تاکہ آپ کی خاص توجہ سے زبان اردو علمی ذخیرہ سے معمور ہو کر آپ کی ممنون احسان بنے -

سرکار! جب علی گڈھ والے اور اہل بنگال بھیک مانگ مانگ کر اپنی یونیورسٹیاں قایم کررہے ہیں تو ہماری اتنی بڑی ریاست میں (خدا اس کو ابدالآباد قائم رکھے) یونیورسٹی کا نہ ہونا اور سلطنت نظام کو مدراس یا پنجاب یونیورسٹی کا محتاج بنا رکھنا ریاست کے لیے کس قدر ندامت بلکہ ذلت کا مقام ہے!

سرکار! جب یہاں مذکورۂ بالا مدارس فنون مثلاً مدرسۂ انجینری مڈیکل اسکول، فارسٹ اسکول مدرسۂ طب یونانی مدرسۂ صنعت و حرفت وغیرہ کو ترقی دے کر بڑے پیمانہ پر قایم کیا جائےگا تو خودبخود یونیورسٹی قایم ہوجائےگی»۔

مدراس کے اس دور میں شایع ہونے والے اخبارات کے پیش نظر صرف ایک ہی چیز تھی اور وہ یہ کہ ریاست حیدرآباد کے متعلق خامہ فرسائی کی جائے اور اگر ہوسکے تو وہاں کے عہدہ‌داروں کی ہمدردی حاصل کی جائے۔ چناں‌چہ جولائی سنہ ۱۹۰۰ عیسوی میں ایک اور ھفتہوار اخبار «آفتاب دکن» کے نام سے سید جلال‌الدین صاحب گھائل نے جاری کیا۔ یہ اخبار آٹھ صفحوں کا تھا اور مطبع عطاءالرحمن میں چھپ کر شایع ہوا کرتا تھا۔ مدراس کے اچھے شاعروں میں گھائل صاحب کا شمار تھا۔ وہ ایک مدت تک مدراس میں مقیم رہے۔ اپنی عمر کے آخر زمانہ میں مدراس سے منتقل ہوکر وانمباڑی چلے گئے اور وہاں اسلامیہ کالج کے اردو و فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ گھائل صاحب کی تحریر نہایت سلجھی ہوئی اور بامحاورہ ہوا کرتی تھی۔ ان کے اخبار (نمبر ۳ جلد ۱ مورخہ یکم اگست سنہ ۱۹۰۰) کے اداریہ سے جس کا عنوان «پرنس آف ارکاٹ اور تعلیم صاحبزادگان» ہے ایک اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے جس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ آج سے چالیس برس پیشتر مدراس کے اردو اخبارات اپنی زبان کے لحاظ سے ہندستان کے دوسرے صوبوں کے اخبارات سے پیچھے نہ تھے:-

«جب کسی خوش حال مسلمان کو ہم مصروف تعلیم و تربیت دیکھتے ہیں تو دل بالکل باغ باغ ہوجاتا ہے اور بے اختیار یہ دعا زبان پر آتی ہے کہ خداوندا تو اس کو اپنے مساعی میں کامیاب کر کیونکہ ایک دن تھا کہ مسلمان چار دانگ عالم پر حکمران تھے۔ ان کی سطوت اور ان کی صولت کا جابجا چرچا تھا ان کی ترقیوں اور ان کی تدبیروں

کا شہر بہ شہر شہرہ تھا، علوم میں یہ نامور تھے فنون میں یہ افسر تھے، ان کے اقبال کا ستارہ ثریا کے پار گزرا، تھا اور ان کی دولت کا آفتاب قطبین پر چمکا تھا۔ اب جو دیکھیے بالکل کایا پلٹ گئی ہے، مقدمہ الٹا نظر آتا ہے۔ خاص کر ہندستان میں مسلمان کہلانا بے علمی کا سرٹیفکٹ ہے اور بے ہنری کا مصدقہ۔ شاذ و نادر اگر کوئی پڑھا لکھا ہو تو النادرکالمعدوم سمجھا جاتا ہے۔ ہر کہیں یہ ذلیل وخوار ہیں، دولت تو ایک طرف قوت شبینہ کے لیے یہ محتاج اور سرگشتۂ روزگار ہیں۔ یہ ان کا ادبار صرف بے علمی اور کہالت کی وجہ سے ہے۔ نہ تو انھیں علم کا شوق ہے اور نہ محنت کے یہ عادی۔ یہ تو عامہ اسلامیاں کا حال ہے۔ اب امراء اور رؤسا کو دیکھیے، علم سیکھے ان کی بلا اور کسب کریں ان کے دشمن۔ بھالی کے بختاور انا کی گودی سے کیوں اتریں۔ استاد دیوڑھی پر آیا انا نے گالیاں دیں اور اصیلوں نے صلواتیں سنائیں کہ نگوڑا استاد آتا ہے تو صاحبزادہ سہما جاتا ہے، ایسی پڑھائی کی ایسی تیسی کیا کسی کی نوکری کرنی ہے کہ خواہ مخواہ علم سیکھیں خدا کا دیا بہت کچھ ہے آرام سے گزر سکتی ہے۔ پھر تو بےچارہ معلم اپنا سا منھ لیا جاتا ہے۔ ولو بالفرض اگر کبھی نواب صاحب کی خاص خبرداری سے کسی دن مکتب میں بیٹھنا بھی نصیب ہوتا ہے بس حضرت جی ع "الٰہی غنچۂ امید بکشاے" کی تسبیح لگائے رہتے ہیں مگر میاں کا غنچۂ دھن کھلتا ہی نہیں اور زبان حرف آشنا ہوتی ہی نہیں۔ آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی رہتی ہیں اور دل کا حال کیا پوچھنا ع "مراد خاص خاطر مرگ استاد" اس ایک روز کا مکتب میں بیٹھنا غضب ہوگیا پھر تو ہفتہ بھر جمعہ ہی رہی۔ یہ تو ابتدائی حال ہے جب صاحبزادہ صاحب پر و بال نکالتے ہیں تو البتہ کچھ سیکھتے ہیں، وہ کیا؟ پتنگ آپ اچھی طرح لڑائیں، گنجیفہ آپ اچھا کھیلیں اور شاطر آپ کہلائیں، اگر کچھ پڑھیں لکھیں بھی تو اس کی معراج یہی ہے کہ شاعر غرا کہلائیں اور جھوٹ بولنے اور خیالی پلاؤ پکانے کا تمغہ حاصل کریں جس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ ایک دو بطن میں اثاثالبیت خالی ہوجاتا ہے....."۔

اس اخبار میں کبھی کبھی نظمیں بھی شائع ہوا کرتی تھیں لیکن اخبار کا اکثر حصہ

حیدرآباد دکن، ممالک اسلامی، ہند و بیرون ہند کی خبروں کے لیے وقف تھا۔ بعد کے واقعات سے پتا لگتا ہے کہ اس اخبار کو اپنے مقاصد میں کامیابی نہیں ہوئی اور حسب امید عہدہ داران ریاست کی سرپرستی میسر نہ ہوسکی اس لیے اخبار بہت جلد بند ہوگیا۔

اس مختصر مضمون کو ختم کرنے سے پہلے انیسویں صدی کے آخر دور کے اخبارات کی دو ایک عمومی خصوصیات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ۱۸۸۰ سے ۱۸۹۰ تک کا زمانہ مدراس میں اردو اخبارات کی ترقی کے سلسلے میں منتہائے عروج کا تھا۔ اسی دور سے یہاں کی اردو صحافت کو بھی زوال شروع ہوتا ہے۔ اب تک مسلمانان مدراس میں فارسی اور عربی تعلیم کا چرچا کافی تھا لیکن ۱۸۸۰ ع کے بعد مسلمانوں کے اعلیٰ اور متوسط طبقہ کے افراد میں فارسی اور اردو کی جگہ انگریزی نے لے لی اور رفتہ رفتہ اردو اخباروں کے دلدادہ حضرات کی تعداد میں خاصی کمی ہونے لگی۔ اس کے علاوہ کرناٹک کے انگریزوں کے حوالے ہونے کے بعد ہندو فارسی سے منہ موڑ چکے تھے ورنہ والاجاہی حکومت کے زمانے میں متعدد ہندو شعرا فارسی میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ ملک العلماء بحرالعلوم مولانا عبدالعلی لکھنوی کے تلامذہ میں متعدد ہندوؤں کے نام پائے جاتے ہیں۔ مدراس کی جامع مسجد جو والا جاہی کے نام سے مشہور ہے اس کے محراب پر فارسی قطعۂ تاریخ ایک ہندو فارسی دان شاعر کی موزونی طبع کا نتیجہ ہے۔ ۱۸۵۰ سے پہلے مدراس کے پریسیڈنسی کالج سے کامیابی کی سند لینے والے طلبہ میں اردو و فارسی داں طلبہ کے نام پائے جاتے ہیں۔ ان واقعات کی بنا پر یہ قیاس غلط نہیں ہوسکتا کہ ابتدا میں ہندو بھی کافی تعداد میں اردو اخبارات کے خریدار رہے ہوں لیکن تعلیمی انقلاب کی بدولت جس کی وجہ سے فارسی و اردو کی جگہ انگریزی کو ملی اردو اخبارات کے عوض انگریزی اخبارات کی قدر بڑھنے لگی۔

اردو اخبارات کی مقبولیت عام اور کثرت اشاعت نے بہت سے بیکار انشاپردازوں کو اس امر کی طرف مائل کردیا تھا کہ وہ بھی اخبار جاری کریں اور اپنے ہمعصروں کی طرح فائدہ اٹھائیں لیکن خریداروں کی کمی اور اخبارات کی کثرت کی وجہ سے نفع کے عوض انھیں نقصان برداشت کرنا پڑتا تھا۔ اکثر اخبارات بلند آہنگ دعووں کے ساتھ برآمد

ہوتے تھے لیکن جس سرعت کے ساتھ یہ بند ہوجاتے تھے اس سے عام طور پر یہ خیال پھیل گیا کہ اردو اخبار غیر مستقل اور ناپائدار ہوا کرتے ھیں۔ اس خیال نے مدراس کی اردو صحافت کو بہت بھاری نقصان پہنچایا۔

ایک اور سبب جس کی وجہ سے اردو اخباروں کی اشاعت کو نقصان پہنچا وہ مسلمانوں کی عام اقتصادی حالت سے متعلق ھے۔ غدر سے کچھ دنوں بعد تک مدراس کی سوسائٹی کا اعلیٰ اور متوسط طبقہ مسلمانوں پر مشتمل تھا لیکن مغربی تعلیم کی کمی کی وجہ سے روز بروز ان کی اقتصادی حالت پست ہوتی چلی گئی اور آخرکار ایسے افراد گنتی کے رہ گئے جو اردو اخبارات کی سرپرستی کرسکتے تھے۔ ان اسباب کی بنا پر یہاں کے اردو اخبارات کو تنزل نصیب ہوا۔ اس دور میں صرف دو چار ھی اخبار ایسے رہ گئے تھے جنھوں نے تمام دقتوں کا مردانہ‌وار مقابلہ کیا اور اپنی اشاعت بیسویں صدی میں بھی برابر جاری رکھی۔ ان میں شمس‌الاخبار، جریدۂ روزگار، طلسم حیرت اور قاسم‌الاخبار قابل ذکر ھیں۔

البتہ جنگ عظیم کے دوران میں اردو روز ناموں کی مقبولیت نے یہاں کی صحافت میں کچھ دنوں کے لیے جان ڈال دی لیکن مضامین اور زبان کے لحاظ سے ان اخبارات کا معیار ایسا بلند نہ ہوسکا کہ وہ دوسرے صوبوں کے اخبارات سے مقابلہ کرسکیں۔ اس امر پر بےحد تعجب ہوتا ھے کہ جس شہر میں یک وقت آٹھ دس کامیاب ہفتہ‌وار اخبار جاری رھے ہوں آج وھاں ایک بھی ایسا قابل ذکر ہفتہ‌وار اخبار نہیں ھے جو اپنی طباعت، تحریر اور مضامین کے لحاظ سے دیگر صوبوں کے اخبارات کی برابری کرسکے۔ اس امر کی ضرورت ھے کہ اس صوبے کے اردوداں حضرات اس کی طرف توجہ کریں اور ہو سکے تو ان اسباب کو دور کرنے کی کوشش کریں جن کی وجہ سے ہمارے صوبے کی اردو صحافت روز بروز پست ہوتی جارھی ھے۔

حضرت برق دہلوی مرحوم

(از جناب کیلاش ورما شایق صاحب ہنگامی بی-اے)

«خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں» غالب

حضرت برق دہلوی کا انتقال پرملال ایک ایسا ناقابل برداشت سانحہ ہے جو ایک عرصے تک بھلایا نہیں جا سکتا۔ حضرت برق دہلوی کا ذکر کرتے ہوئے قلم کانپ اٹھتا ہے۔ کسے گمان ہوسکتا تھا کہ یہ چہکتا ہوا بلبل دیکھتے ہی دیکھتے روپوش ہوجائےگا اور گلشن ادب کے گلہاے رنگیں کو پژمردہ کردےگا۔ حضرت برق کی ذات خاص سے اردو ادب کی کتنی امیدیں وابستہ تھیں۔ افسوس، ان امیدوں پر پانی پڑ گیا اور اس کی مرادیں بر نہ آئیں۔

ابھی حضرات رواں، چکبست، عزیز جیسے شعرا کی مرگ ناگہانی کا صدمہ لوگوں کے دلوں سے دور نہیں ہوا تھا کہ دفعتاً ۱۲ فروری ۱۹۳۶ع کو حضرت برق کی وفات کی غمناک خبر ملی۔ پرانا زخم پھر ہرا ہوگیا۔ افسوس، کہ ایسا ہونہار اور بلند پایہ شاعر جس کی پرورش اُس شہر دہلی میں ہوئی تھی جو شاعری کا مرکز تھا اور جہاں مشہورِ زمانہ شعرا میر، ذوق، مومن، غالب، داغ وغیرہ ہوگزرے ہیں، ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگیا۔

جناب برق ۹ فروری ۱۹۳۶ ع کو ایک شاگرد کے اصرار پر ایک شادی کے سلسلے میں اپنے بال بچوں کے ہمراہ پانی‌پت گئے۔ ۱۲ فروری کو آدھی رات کے قریب یکایک آپ کو بےچینی سی معلوم ہوئی اور دل کی حرکت بند ہونے لگی۔ علاج کا معقول

انتظام بھی نہ ہونے پایا تھا کہ انھوں نے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور قدردانان اردو ادب کو داغ مفارقت دےکر مغموم بنا گئے - سچ ہے

عمر برق و شرار ہے دنیا کتنی ناپائدار ہے دنیا

مجھے آپ کی زیارت کی خوش‌نصیبی پہلے پہل کانپور میں حاصل ہوئی - یہ ملاقات صرف چند منٹوں کی تھی - آپ دسمبر ۱۹۳۳ع میں کانپور آل انڈیا مشاعرے میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے تھے - کیا خیال تھا کہ یہ آخری ملاقات ہوگی -

آپ کا نام منشی مہاراج بہادر اور تخلص برق تھا - سکسینہ کایستھ تھے - فن شاعری آپ کو ترکے میں ملا تھا، ماں اور باپ دونوں کی طرف سے - آپ کے والد ماجد کا نام منشی ہرنراین داس حسرت تھا - آپ کے نانا منشی دولت رام عبرت ایک مشہور و معروف شاعر تھے اور حضرت ذوق کے شاگرد تھے - برق کی والدہ زیادہ پڑھی لکھی تو نہ تھیں لیکن وہ اس ہونہار نوعمر شاعر کو روزانہ راماین سنایا کرتی تھیں - انھوں نے مثنوی گلزار نسیم کے بھی کچھ شعر انھیں یاد کرا دیے تھے -

آپ کے خاندان کا وطن قصبہ سکیٹ ضلع ایٹہ ہے - ان کے بزرگوں نے شاہی زمانہ میں دہلی جاکر اونچے اونچے عہدے حاصل کیے تھے - پس برق نے بھی وہیں مستقل سکونت اختیار کی - آپ جولائی ۱۸۸۴ع میں پیدا ہوئے تھے - بچپن ہی سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ آگے چل کر ایک بڑے شاعر ہوں گے - آپ کے شاعرانہ جذبات کی ایک مثال سن لیجیے - بچپن میں آپ کی آنکھ دکھ رہی تھی - ایک دوست نے پوچھا کہو کیا حال ہے، آپ کی زبان سے بےساختہ یہ شعر نکلا :-

دل تو آتا تھا مگر اب آنکھ بھی آنے لگی پختہ کاری عشق کی یہ رنگ دکھلانے لگی

لکھنے کی نسبت برق کو اشعار سننے میں زیادہ لطف آتا تھا - یہی وجہ ہے کہ سیکڑوں اشعار ان کو زبانی یاد ہوگئے تھے جنھیں مزہ لے لے کر بار بار پڑھا کرتے تھے اور لطف اندوز ہوتے تھے - تعلیم کے ساتھ ساتھ شعرگوئی بھی صلاحیت میں ترقی کرتی گئی اور شاعری پرشباب نمودار ہونے لگا - جیسا عرض کیا جا چکا ہے آپ کے والد بھی شاعر تھے اس لیے یہ قدرتی بات تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی شاعری کی قدر کرتے

اور وقتاً فوقتاً ان کے کلام میں اصلاح بھی دیا کرتے تھے - باپ کو بیٹے سے بے حد محبت اور شفقت تھی، کیونکہ برق اپنے پانچ چھے بھائیوں اور ایک بہن کے انتقال کے بعد اپنے باپ کی ڈھلتی عمر میں پیدا ہوئے تھے - ۱۹۰۳ ع میں آپ نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور ساتھ ہی ساتھ مشاعروں میں بھی شرکت کرنے لگے - نتیجہ یہ ہوا کہ روز بروز ترقی ہوتی گئی - ابھی حصول تعلیم کا سلسلہ جاری تھا کہ فروری ۱۹۰۵ ع میں آپ کے والد کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا اور ان کے کاموں میں خلل واقع ہوا - اب مجبوراً تعلم کو خیرباد کہنا پڑا اور دفتر میں معمولی نوکری کر لینی پڑی - رفتہ رفتہ طبعی ذہانت کی وجہ سے آپ افسری کے عہدے پر پہنچ گئے - ملازمت میں ہوتے ہوئے بھی آپ کی شاعری کو برابر فروغ حاصل ہوتا رہا - آپ اپنی خدا داد لیاقت کی وجہ سے پوسٹل آڈٹ آفس میں سپرنٹنڈنٹ جیسے معزز عہدہ کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے -

والد کے انتقال کے بعد جو کمی آپ کی تعلیم میں رہ گئی تھی اسے نجی طور پر بڑی لگن کے ساتھ پورا کیا - ۱۹۱۸ ع میں آپ نے منشی‌فاضل کا امتحان پاس کیا - ۱۹۲۰ ع میں بی - اے کی ڈگری حاصل کی - بعد ازاں آپ نے ۱۹۲۲ ع میں اپنے محکمہ کے سب اکاونٹ سروس کا امتحان پاس کیا - اب آیندہ ترقی کا دروازہ کھل گیا - سرکاری ملازمت اور شعرگوئی جاری رکھتے ہوئے بھی جس قدر جلدی اور جس طرح آپ نے تمام امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کی ان سب سے آپ کی ذہانت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے -

چونکہ برق شاعر کا دل لے کر دنیا میں وارد ہوئے تھے ان کے لیے لازمی ہوگیا کہ وہ کسی سے شرف تلمّذ حاصل کریں پس اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے آغا شاعر دھلوی کے شاگرد ہوئے -

شروع شروع میں برق نے اپنا تخلّص کچھ اور رکھا تھا لیکن بعد میں منشی دوارکاپرشاد افق کے کہنے پر برق رکھا -

برق شروع میں منشی درگا سہائے سرور جہاں‌آبادی کے کلام کا بغور مطالعہ کرتے تھے اور ان کے ثناخواں تھے - آپ سرور کے کلام سے متاثر ہوئے اور ان کے

کلام کا اثر برق پر بہت گہرا پڑا اور ان کی طبیعت کا رجحان طرز جدید شاعری کی طرف ہوا۔ یہ رغبت روز بروز بڑھتی ہی رہی۔ یہ اثر سرور کی نظموں ہی کی بہ دولت ہوا تھا۔ دوسرا اثر جو ان پر پڑا وہ انگریزی زبان کے شاعروں کا تھا۔ آپ انگریزی کے نامور شعرا مثلاً ورڈس ورتھ، کیٹس، شیلی، ٹینی سن، براؤننگ کے کلام کا دلچسپی اور غور و خوض سے مطالعہ کیا کرتے تھے۔

آپ کو نظم گوئی اور غزل گوئی دونوں میں یکساں ملکہ تھا لیکن پھر بھی میرے خیال میں آپ کی نظمیں آپ کی غزلوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ فوقیت رکھتی ہیں۔ آپ کے کلام میں تشبیہات اور استعارات نادر ہوتے ہیں اور ایک خاص خصوصیت رکھتے ہیں۔ زبان دل‌چسپ، سادہ اور عربی فارسی ترکیبوں سے مبرا ہوتی ہے۔ طرز بیان نیا اور اپنا جداگانہ رنگ رکھتا ہے اور پر اثر ہوتا ہے۔ خیالات بلند، پاکیزہ اور موثر ہوتے ہیں۔ آپ کی غزلوں میں زیادہ تر معرفت کا رنگ غالب رہتا ہے۔ آپ کی نظمیں بھی حقائق و معارف کا ایک صاف اور شفاف آئینہ ہیں جس میں شاعرانہ دلی جذبات کا عکس مکمل طریقے پر ظاہر ہوتا ہے۔ یہ خوبی برق کے کلام میں بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ قدرتی مناظر کا مشاہدہ شاعر نے نہایت غور و خوض سے کیا جس کا اظہار آپ کے کلام سے ہوتا ہے۔ آپ نے مذہبی، تاریخی، سماجی، فلسفیانہ وغیرہ ہر رنگ میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر فن میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ موقع موقع پر محاکات بھی نظر آتے ہیں۔ برق پر معمولی سی معمولی باتوں کا جلد اثر پڑتا تھا اور ذرا سی بات پر گھنٹوں سوچتے بچارتے رہتے تھے۔ تیج دہلی کے دفتر میں آپ نے ایک نظم بہ عنوان "گلشن شباب کی رنگینیاں شباب کے ساتھ" پڑھ کر سامعین کو بحر غم میں ڈبو دیا تھا۔

ابتداء آپ نے ناٹک لکھنا بھی شروع کیا تھا۔ لیکن یہ ڈرامہ نگاری کا سلسلہ عرصہ تک قائم نہ رہا اور نہ اس فن میں آپ کو زیادہ کامیابی ہی حاصل ہوئی۔ برق کا ایک ڈرامہ "ساوتری" کئی بار اسٹیج پر کھیلا گیا اور اسے لوگوں نے پسند بھی کیا لیکن افسوس کہ وہ کتابی صورت میں شایع نہ ہوسکا کیونکہ اس کا مسودہ گم ہوگیا تھا۔

آپ میں ایک فطری خوبی یہ تھی کہ آپ ہر طبقہ کے لوگوں سے اچھی طرح ملتے جلتے تھے۔ آپ نہایت خوش‌مزاج، نیک سیرت اور فرشتہ خصلت آدمی تھے۔

سب سے پہلی غزل جو برق نے ۱۹۰۴ ع میں اپنے استاد کے پاس اصلاح کے لیے بھیجی تھی اس کے دو شعر ملاحظہ ھوں :

ھمارے خون کی مھندی لگالو دست خنجر میں
قسم ھے ایک ھی ھوگئے، تمھیں تم ھوگے محشر میں
سوال بوسۂ ابرو پہ جھنجھلا کر کہا اس نے
کوئی تلوار کا بھی نام لیتا ھے بھرے گھر میں

آپ نے سب سے پہلی غزل جو دھلی کے ایک مشاعرے میں پڑھی اس کا مطلع:

خاک ارمان نکالے کوئی بسمل اپنا	مثل شمشیر کھنچا جاتا ھے قاتل اپنا

لوگوں نے بہت پسند کیا اور آپ کو کافی داد ملی۔ اور دوسری غزل جو آپ نے ایک بڑے مشاعرے میں پڑھی اس کے یہ دو شعر :

وفائیں کر کے تم سے بیوفائی دیکھنے والے	ھمیں تو ھیں بھلائی میں برائی دیکھنے والے
نقاب الٹی صبا نے سامنے میرے تو فرمایا	کہ اب تو ھر طرح تیری بن آئی دیکھنے والے

سامعین نے بہت پسند کیے۔

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعہ سے معلوم ھوتا ھے کہ آپ کے شروع کا کلام بالکل لکھنوی رنگ میں شرابور ھوتا تھا لیکن رفتہ رفتہ آپ کی غزلوں میں وہ رنگ پیدا ھوا جو اس زمانہ میں باعث فخر سمجھا جاتا ھے۔

برق کی سب سے پہلی نظم جو ۱۹۰۸ ع میں رسالہ زبان دھلی میں شایع ھوئی تھی وہ "کار خیر" تھی۔ اس نظم کو لوگوں نے اس قدر پسند کیا کہ وہ کئی بار پمفلٹ کی شکل میں شایع ھوئی۔ آپ فرماتے ھیں :

شریک درد دل ھوکر کسی کا دکھ بٹایا ھے	مصیبت میں کسی آفت زدہ کے کام آیا ھے
پرائی آگ میں پڑکر کبھی دل بھی جلایا ھے	کسی بیکس کی خاطر جان پر صدمہ اٹھایا ھے

کبھی آنسو بہائے ھیں کسی کی بدنصیبی پر
کبھی دل تیرا بھر آیا ھے مفلس کی غریبی پر

کبھی امداد دی تو نے کسی بیکس بچارے کو سخی بن کر دیا کچھ تو نے مفلس کے گزارے کو
تسلی دی کبھی تو نے کسی آفت کے مارے کو کبھی تو نے سہارا بھی دیا ہے بےسہارے کو
کبھی فریاد رس بن کر خبر لی بے نواؤں کی
لگی ہے چوٹ بھی دل پر صدا سن کر گداؤں کی

یہ نظم واقعی پر اثر ہے ۔ زبان اتنی سادہ اور شیریں ہے کہ کان اسے بار بار سن کر بھی آسودہ نہیں ہوتے۔ شاعر اس نظم کے ذریعے کتنے سوال کرتا ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ پھر ایک ہی سوال کو کتنی بار اور مختلف ڈھنگ سے کن خوبیوں سے ادا کرتا ہے۔ شاعر میں جتنی قوت فکر ہوگی وہ اتنا ہی اسے وسعت دے کر بیان کرےگا۔ آج جب ہم برق کا کلام پڑھ کر محظوظ ہوتے ہیں تو دل میں فوراً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ ابھی کچھ عرصے تک اور زندہ رہتے تو اردو ادب میں اپنے کلام کے ذریعہ ایک قابل قدر اضافہ کرتے ۔

برق نے بسنت پر چھے نظمیں مختلف رنگ میں لکھی ہیں۔ اس مختصر مضمون میں آپ کی ہر نظم کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرنا مشکل ہے کیوں کہ مضمون کے طویل ہونے کا احتمال ہے ۔ اس لیے یہی مناسب ہوگا کہ آپ کی نظموں کے صرف وہی بند پیش کیے جائیں جو ہردلعزیز اور قابل ستائش ہیں ۔ بسنت رت کا آغاز پت جھڑ کے بعد ہوتا ہے ۔ بہار کا وقت آتا ہے، نئی نئی کونپلیں نکلتی ہیں۔ آموں میں بور آتے ہیں۔ انواع و اقسام کے پرندے اپنی خوش الحانی سے فضا میں سرور کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ ٹیسو کا پھول انوکھی بہار دکھلاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے بن میں آگ لگی ہوئی ہے۔ سرسوں کے کھیت کی طرف جب ہماری نگاہ جاتی ہے تو حضرت چکبست لکھنوی کے خیال کے مطابق ایسا معلوم ہوتا ہے "بجائے خاک کے اڑتا ہے رنگ سرسوں کا"۔ سردی میں کمی ہونے لگتی ہے، صرف گلابی سردی رہ جاتی ہے۔ شاعر ان خیالات کا ذکر کتنے لطیف پیرایہ میں کرتا ہے، ملاحظہ فرمائیے :-

بسنت رت کیا جہاں میں آئی پیام دور بہار آیا
نظر ہے مست شراب جلوہ کہ روئے گل پر نکھار آیا

اچھوتی کلیوں کے بھی لبوں پر تبسم بےقرار آیا
نئے شگوفے کھلائے گویا یہ موسم خوش‌گوار آیا

نصیب سبزے کے جاگ اٹھے ستارہ ھے اوج پر چمن کا
جما ھے نقشہ روش روش پر شگفتہ پھولوں کی انجمن کا

اب سرسوں کے کھیت کا بیان دیکھیے، کتنا دل‌چسپ ھے :—
سماں یہ سرسوں کے کھیت کا ھے کہ زعفراں زار کھل رہا ھے
فضا میں کندن دمک رہا ھے سرور آنکھوں کو مل رہا ھے

سرسوں کے کھیت کیا ھیں کیسر کی کیاریاں ھیں
قدرت کی خاک پر یہ زیبا نگاریاں ھیں

پھولی ھوئی ھے سرسوں تابندہ شرارے ھیں
یا خاک کے دامن پر چھٹکے ھوئے تارے ھیں

کہاں ھے سردی کی سرد مہری شباب جاڑے کا ڈھل چکا ھے
ھوا ھے آغاز دور نو کا زمانہ کروٹ بدل چکا ھے
کھلی ھے خوابیدہ چشم نرگس روش پہ سبزہ سنبھل چکا ھے
قبائے غنچہ ھے چاک خوردہ کلی کا دامن نکل چکا ھے
خزاں الم سے چراغ پا ھے کہ آتش گل بھڑک رھی ھے
بہار کی ھے جو آمد آمد چمن کی قسمت چمک رھی ھے
کھلے ھیں ٹیسو کے پھول بن میں ضیا فگن ھے شفق زمیں پر
چنے ھیں قدرت نے سبز شاخوں پہ شیشہ ھائے شراب احمر

جب ان پہ پڑتی ھے ھلکی ھلکی شعاع سیمین ماہ انور
مرقع شان دل‌فریبی دکھاتا ھے جاں فروز منظر
لگائے صحرا کو لعل اس نے جو وجہ زیبائش چمن ھے
نہال فطرت کے فیض سے ھے زمین گلزار ھے کہ بن ھے

کتنی پیاری تشبیہات ہیں، کتنے اچھوتے استعارات اور کتنا اونچا خیال ہے۔

گلہائے اشرفی کا سکہ چلا چمن میں شبنم نے ہر کلی کے موتی بھرے دھن میں

اوس کا کلیوں کے منہ میں موتی بھرنا کتنا اعلیٰ تخیل ہے۔

شگوفہ کاری فطرت کا ہر طرف ہے ظہور شگفتگی سے چمن زار دھر ہے معمور

وفور جلوۂ گل سے برس رہا ہے نور نگاہیں کیف میں ڈوبی ہیں دل ہے مستِ سرور

کلی کلی گرہ رنگ و بو ہے گلشن میں

بسنت رت میں یہ شان نمو ہے گلشن میں

اگر آپ کی تشبیہات اور استعارات کا زیادہ لطف اٹھانا مقصود ہو تو آپ کی نظم بہ عنوان "جگنو" کا مطالعہ کرنا چاہیے:

مہ پروانہ یہ لعل یمنی ہے شاید اڑتی پھرتی کوئی ہیرے کی کنی ہے شاید

کسی ناشاد کی آہوں کا شرارا تو نہیں آسماں سے کوئی ٹوٹا ہوا تارا تو نہیں

شوخیوں میں تری ہیں برق نظر کے انداز تیری پرواز میں ہیں رقص شرر کے انداز

تیرے جلوے سے منوّر ہوا صحن گلشن

تو ہے وہ شمع کہ ہے موج ہوا پر روشن

آخری شعر کس قدر ستائش کا مستحق ہے۔ شاعر نے جگنو کو ہوا میں جلنے والا چراغ کہہ کر ایک نئی بات پیدا کی ہے جو بالکل ٹھیک ہے اور لوگ اس کو مانتے بھی ہیں۔ اس ایک لفظ نے شعر میں جان پیدا کر دی ہے۔

اب آپ کی نظم بہ عنوان "گنگاجی" دیکھیے، یہ بھی اپنے رنگ میں بےمثل ہے:

رنگت میں چاندنی سے اجلا بدن ملا ہے آب رواں کا ہلکا سا پیرہن ملا ہے

ہر موج کا ہے دعوی مہتاب کی کرن ہو آئینۂ صفا ہو سیماب پیرہن ہو

ہر لہر کہہ رہی ہے اک موج نور ہوں میں ہے ہر حباب گویا جام بلور ہوں میں

پانی کے آئینے میں تارے ہیں عکس افگن یا جلوۂ چراغاں ہے تیرے زیر دامن

بھارت کی سرزمیں کے تجھ سے نصیب جاگے پانی بھرے نہ کیوں پھر ہر بحر تیرے آگے

آخری شعر میں ایک بےمثل بات کہی ہے۔ شعر اعلیٰ پایہ کا ہوگیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ محاورہ بھی نہایت خوبی سے بٹھایا گیا ہے۔ گنگاجی کا درجہ کتنا بلند ہے۔ اس

کے آگے سمندر بھی پانی بھرتا ہے یا یوں کہیے کہ سمندر اپنے میں گنگا جی کا پانی لیتا ہے۔ اور دیکھیے:

مسکن ہے تو قدیمی اسلاف کا ہمارے ڈالے رہے ہیں ڈیرے صدیوں ترے کنارے
تھا شان‌دار کیسا دور کہن ہمارا فردوس بر زمیں تھا گویا وطن ہمارا
ہے تجھ کو یاد ازبر وہ داستاں ہماری لہریں تری ورق ہیں تاریخ کے ہماری
دامن میں تیرے پنہاں خاکستر سلف ہے گنج گہر نہاں ہے جس میں تو وہ صدف ہے
تو عظمت گذشتہ کی آج تک امین ہے جاہ و جلال تیرے پہلو میں تہ نشیں ہے
وحدانیت کا نغمہ موجوں کے ساز میں ہے اعجاز حق نمائی رنگ مجاز میں ہے

کیا کہنا۔ آخری شعر بےنظیر ہے۔ گنگاجی جس وقت بہتی ہیں لہروں میں آواز پیدا ہوتی ہے، وہ آواز کیا ہے؟ حمد خدا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسن عالم میں جو ندی کی لہروں میں نظر آتا ہے، ہم جلوۂ حق دیکھ سکتے ہیں - تیسرے شعر میں آپ نے بتلایا ہے کہ گنگا جی کی ہر لہر گویا ہماری تاریخ بتلا رہی ہے جس کو دیکھ کر ہم اپنے زمانۂ قدیم ہندستان کی عظمت کا قیاس کرسکتے ہیں۔
تاروں بھری رات کا کیا اچھا نقشہ کھینچا ہے:

کیا گل ہیں کھلے دامن گلزار فلک پر صدقے ہیں زر و لعل و گہر جن کی چمک پر
لیلاے شب اوڑھے ہوئے تاروں کی ردا ہے کیا حسن ضیا پاش ہے دل جس پہ فدا ہے
داماں فلک پر گل خوش رنگ پڑے ہیں
یا سقف زمرد میں در و لعل جڑے ہیں

آخری شعر کس غضب کا ہے۔ بےاختیار منہ سے تحسین آفریں کلمے نکلنے لگتے ہیں۔

آپ نے تاریخی نظمیں بھی لکھی ہیں جیسے «پدمنی کا جوہر»، «بھیلنی کے بیر یا پریم کا تحفہ»، «راجکماری پنّا»، «شکتی بان»، «پرتاب کی تلوار» وغیرہ وغیرہ۔ یوں ہر نظم اپنا خاص رنگ اور خاص نوعیت اور اہمیت رکھتی ہے لیکن جب ہم «میرا بائی» اور «بھیلنی کے بیر» پڑھتے ہیں تو کیف آمیز کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ ہمیں ان نظموں کے مطالعہ سے بھگتی اور پریم کا اچھا سبق ملتا ہے۔ نظم «میرابائی»

اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اس نظم میں آپ نے پاکیزہ خیالات کے دریا بہادیے ہیں۔ شاعرانہ جذبات اپنی ایک عجیب ندرت رکھتے ہیں:

بھگوان کرشن کے مندر میں ہے محو ثنا میرابائی
اک بین ہے دست نازک میں لب وقف نغمہ آرائی
کیا راگ ہے کیا لےکاری ہے اک وجد کا عالم طاری ہے
جو سر ہے پریم کٹاری ہے جو زخم ہے زخم کاری ہے
احساس خودی کافور ہوا عرفان سے دل معمور ہوا
یکرنگی پریمی پریتم ہیں اب پردۂ حائل دور ہوا

میرا کو کرشن بھگوان سے پریم تھا۔ ان کی بھگتی کا بکھان سن کر شہنشاہ اکبر تان‌سین کے همراہ ان کے پاس جاتا ہے اور میرا کی بھگتی دیکھ کر بہ‌ادب کہتا ہے:

اے دیوی! کرشن مراری کو ہم بھینٹ چڑھانے آئے ہیں
تیرے روحانی نغموں سے کھنچ کر دیوانے آئے ہیں
لے یہ ہیروں کی مالا ہے یہ ادنیٰ نذر ہماری ہے
کر ارپن ان کی سیوا میں تو جس کی پریم بھکاری ہے

اس نظم کے مندرجہ بالا اشعار کے ایک ایک لفظ پر غور کیجیے اور شاعر کے خیالات کی داد دیجیے جس کے وہ بدرجہ اولی مستحق ہیں۔ زبان کتنی سلیس اور روزمرہ ہے۔ الفاظ میں کتنی شیرینی اور مصرعوں میں کتنا ترنم ہے۔ ایسی نظمیں فوری اثر کرنے والی ہوتی ہیں۔ شاعرانہ جذبات کی بےعدیل مثال اس نظم میں پائی جاتی ہے۔ اس نظم کے مطالعہ سے معرفت کا دریا دل میں موجزن ہوتے لگتا ہے۔

ایک اور تاریخی نظم بہ عنوان «اچھوت ادھار» اپنا پایہ نہیں رکھتی۔ شری رام چندرجی مہاراج بن باس کی حالت میں جنگلوں میں گھومتے ہوئے اتفاقاً اچھوت سیوری کے جھونپڑے میں پہنچتے ہیں۔ سوری با عزت ان کی خاطر مدارات کرتی ہے اور انھیں کھانے کے واسطے بیر پیش کرتی ہے۔ رام جی بلا ذات پات کا خیال کیے ہوئے بیر کھانے لگتے ہیں۔ ان کے دل میں زیادہ احساس پذیر شے سیوری کا اخلاص اور مدارات ہے

شری رام کے نزدیک ان خوبیوں کے سامنے دھرم اور مذہب کوئی چیز نہیں ہے۔ اخلاص اور صدق دلی کا درجہ کہیں زیادہ رفیع اور با عظمت ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

بھگوان نے اخلاص و مدارات کو دیکھا   وا رفتۂ دیدار کے جذبات کو دیکھا
کچھ ذات کو دیکھا نہ کچھ اوقات کو دیکھا   دیکھا تو فقط پریم کی سوغات کو دیکھا

ڈوبے ہوئے تھے بیر محبت کے جو رس میں
خود پریم کے ساگر بھی ہوئے پریم کے بس میں

دراصل پریم اور محبت اسی کا نام ہے۔ فرضی پریم کوئی پریم نہیں ہے اور نہ یہ کوئی حقیقت ہی رکھتا ہے۔

آپ کا کلام زیادہ‌تر زمانہ، ادیب، مخزن، زبان اور تیج جیسے مشہور ماہانہ اردو رسائل میں شایع ہوتا تھا۔ آپ کی نظموں کا مجموعہ «مطلع انوار» کے نام سے ۱۹۲۹ع میں شایع ہوا تھا۔ آپ کی غزلوں کا مجموعہ «تجلّیات برق» کے نام سے شایع ہونے والا تھا لیکن افسوس کہ وہ ان کی زندگی میں شایع نہ ہوسکا اور آپ کی یہ دلی خواہش پوری نہ ہوسکی۔ «مطلع انوار» میں مذہبی، سماجی، تاریخی سب ہی طرح کی نظمیں ہیں اور تمام نظمیں اپنے اپنے رنگ میں بےمثل ہیں۔ یہ بات صرف آپ کے کلام کا مجموعہ پڑھنے سے عیاں ہوتی ہے۔

ماہ جون ۱۹۱۳ع کے رسالہ زمانہ میں آپ کی ایک نظم «راجہ اج کا بلاپ» شایع ہوئی تھی۔ رانی اندومتی بددعا کے باعث آکاش سے ایک پھولوں کی مالا گرنے سے یکایک مرجاتی ہے۔ راجہ درد و کرب کے ساتھ بلاپ کرتے ہیں۔ نظم بےحد پردرد اور پر تاثیر ہے۔

اف اف یہ دردناک صدا کس غضب کی تھی   آواز دلخراش یہ کس جاں بلب کی تھی
کیا وجہ یہ شکست خموشئ شب کی تھی   یہ آہ دل‌گداز کس ایذا طلب کی تھی

یہ کون چپ ہوا نفس سرد کھینچ کر
دی کس نے جان نالۂ پردرد کھینچ کر

نظم «جوش بہار» میں شاعر نے ایسے ایسے الفاظ منتخب کرکے رکھے ہیں کہ نظم

میں موسیقی کا لطف پیدا ہوگیا ہے جو شعر کی جان ہے - پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہار کی لہر رگ رگ میں دوڑ رہی ہے اور اس میں وہ رس بھر رہی ہے جس میں بہار کے آتے ہی سارے اجزائے قدرت تروتازہ ہوجاتے ہیں - قوت نمو کا جوش موجزن ہونے لگتا ہے - ان خوبیوں کو شاعر نے کس ندرت کے ساتھ ایک عجیب طرز میں بیان کیا ہے - ملاحظہ فرمائیے :

گھرا ہوا سر فلک جو ابر قطرہ بار ہے خزاں پہ اوس پڑگئی چمن چمن بہار ہے
گلوں کے روئے صاف پر کمال کا نکھار ہے ورق ورق ہے خوشنما نظر نظر نثار ہے

جمی تھی برگ برگ پر جو گرد اب وہ دھل گئی
کلی کلی نکھر گئی، گرہ دلوں کی کھل گئی

نمو کا آشکار ہے، بساط خاک سے عیاں بچھا ہے فرش مخملی گیاہ نو سے ہے عیاں
اگل رہی ہے لعل اب زمین باغ بے گماں روش روش کھلے ہیں گل چمن ہے روکش جناں

کلی ہے نیم وا کوئی دلہن ہے یا حجاب میں
کھلا ہوا ہے نیم رخ ہے نیم رخ نقاب میں

« مطلع انوار » میں جو برق کی ایک بلند پایہ تصنیف ہے اس قسم کے قدرتی مناظر پر اچھی اچھی نظمیں ملیں گی مگر اس طرح کی بہت ہی کم ملیں گی - اگست ۱۹۱۳ع کے رسالہ ادیب میں برق کی ایک نظم « سیتاجی اشوک بن میں » کے عنوان سے شایع ہوئی تھی - نظم بےنظیر ہے - شاعر کو اس نظم میں کامیابی حاصل ہوئی ہے - اس کا بھی لطف اٹھائیے :

سراپا یاس کی صورت مجسم نقش حیرانی کھڑی ہیں سرنگوں زیر شجر سیتا مہارانی
پریشاں تا کمر ہیں موئے سر بیگانۂ تزئیں لباس جوگیا ہے پردہ دار جسم نورانی
برستا ہے ملال دلنشیں مغموم چہرے سے نگاہ مضطرب ہے ترجمان درد پنہانی
ہجوم درد میں پنہاں ہو جیسے شعلۂ آتش نہاں الجھے ہوئے بالوں میں ہے یوں نور پیشانی

سیتا جی کی زبانی :

یہ کن کرموں کا بدلہ لے رہا ہے اے فلک مجھ سے یہ کن پاپوں کے کارن ہوں گرفتار پریشانی

غضب ڈھایا اکیلا پا کے مجھ کو دشت راون نے دیا دھوکا خلاف رسم آئین جہانبانی
پتی برت دھرم سے لیکن گرا سکتا نہیں مجھ کو میں ستونتی ہوں کرکے ہی رہوں گی اپنی من مانی
زمین و آسمان زیر و زبر ہوجائیں ممکن ہے مگر یہ غیر ممکن ہے بنوں لنکا کی پٹ رانی

آپ کی ایک نظم بہ عنوان "شمع کشتہ" نہایت دلکش اور لطیف ہے ۔ شاعرانہ جذبات کی نادر مثال اس نظم میں پائی جاتی ہے ۔ شاعر نے اس چھوٹے اور معمولی مضمون کو غیر معمولی اور موثر انداز میں بیان کیا ہے ، آپ فرماتے ہیں :

رات بھر جلوہ فروز محفل عشرت رہی بزم میں تیری تجلی وجہ صد زینت رہی
تیرے پروانوں سے شب بھر گرمیٔ صحبت رہی دونوں جانب سے بھڑکتی آتش الفت رہی
کوئی پروانہ جو گر کر ہوگیا فی النار بھی
تا سحر ٹوٹا نہ تیرے آنسوؤں کا تار بھی

رات بھیگی اوس نے چھینٹے دیے گلزار پر آگیا کچھ کچھ عرق تیرے گل رخسار پر
پھر گئی زردی سی روئے مطلع انوار پر رات بھاری ہوگئی تیرے دل بیمار پر
لاکھ ہاتھوں چھاؤں رکھا اہل محفل نے تجھے
خاک کر ڈالا جلا کر سوزش دل نے تجھے

ضو فشاں جب جلوۂ رنگ شفق ہونے لگا خاکدان دہر کا روشن طبق ہونے لگا
تیرے روئے آتشیں کا رنگ فق ہونے لگا عارض رنگیں ترا سادہ ورق ہونے لگا
ہستیٔ بےبود آخر دے گئی دھوکا تجھے
کر گیا ٹھنڈا نسیم صبح کا جھونکا تجھے

تیرے گل ہوتے ہی قصہ مختصر کچھ بھی نہ تھا خواب کا نقشہ تھا سب رنگ اثر کچھ بھی نہ تھا
کھل گیا جز بےثباتی جلوہ گر کچھ بھی نہ تھا رات بھر کی ساری رونق تھی سحر کچھ بھی نہ تھا
شمع کشتہ تو مجسم یاس کی تصویر ہے
یا بیاض صبح پر اندوہ کی تفسیر ہے

برق اہل فن شاعر تھے اور یہی وجہ ہے کہ آج تک ان کا نام اردو ادب میں قائم ہے اور اس وقت تک قائم رہے گا جب تک اردو ادب کا وجود

رهے گا - هر شاعر کا رنگ اور طرز بیان جداگانه هوتا هے - شاعر اپنی ایک امتیازی خصوصیت لے کر آتا هے اور اگر وه اخیر تک اپنے خاص انداز کو اپنائے رهے تو بلاشبهه وه اپنے رنگ کا موجد اور بلند پایه شاعر هوکر رهےگا - برق کی بےوقت وفات سے اردو ادب میں ان کے قدردانوں کو دلی صدمه هوا - قدردانان اردو ادب نے آپ کے غم کا اظهار مختلف طریقوں پر کیا - ماتمی مجلسیں منعقد هوئیں ' کچھ شاعروں نے نوحه کے ذریعه اپنے غم کا اظهار کیا اور کچھ نثر نگاروں نے به ذریعه نثر - قصه کوتاه آج تک اردو ادب آپ کے غم هجر میں آپ کا ماتم منا رها هے -

آپ کی نظموں کے اتنے نمونے پیش کرنے کے بعد اب مناسب هوگا که آپ کے اردو منظوم ترجمے بھی اهل ادب کے سامنے پیش کیے جائیں - آپ نے انگریزی زبان کی نظموں کا بھی اردو منظوم ترجمه کیا هے - ڈاکٹر سر رابندرناتھ ٹیگور کی بلند پایه اور شهرهٔ آفاق تصنیف گیتا نجلی کا بھی کچھ حصه اردو زبان میں نظم کیا هے - اس کے علاوه آپ نے اور بھی مختلف زبانوں کے ترجمے کرکے اردو ادب میں ایک بیش بها اضافه کیا هے - ترجمه کا کام کوئی آسان اور معمولی کام نهیں هے - صرف وهی شاعر اس فن میں کامیاب هوسکتا هے جس میں یه ملکه خدا داد هو - برق میں یه بھی خصوصیت پائی جاتی تھی که وه هر زبان کی نظموں کا اچھا اور کامیاب ترجمه کرسکتے تھے -

اب آخر میں آپ کی غزلوں کے بھی کچھ نمونے پیش کرنا لازم هوگا تاکه اس بات کا انکشاف اردوداں پبلک پر عام طور سے هوجائے که شاعر کے آخری زمانے کی غزلوں میں کس رنگ کی کثرت هے - جیسا پیشتر عرض کیا جاچکا هے شاعر نے شروع میں لکھنوی انداز بیان کو اپنا کر اپنے اشعار میں تغزل کی شان پیدا کی لیکن جوں جوں زمانه گزرتا گیا اور اس قسم کے اشعار متروک سے نظر آنے لگے اور قدردانان اردو ادب میں اس کی کچھ اهمیت نه ره گئی ' شاعر نے زمانے کے ساتھ ساتھ اپنے انداز بیان میں بھی تبدیلی واقع کردی اور اس میں فلسفه' حقائق و معارف وغیره کا شائبه نظر آنے لگا -

غزل کا میدان بهت تنگ هے لیکن پھر بھی اسے وسعت دی جاسکتی هے - اسے وسیع

کرنے کے لیے ضرورت ہے خیالات کی بلند پروازی کی، نئی تشبیہات اور اچھوتے استعارات کی۔ ہمارے قدیم شعرا نے غزل میں بہت کچھ کہا اور بہت سی یا یوں کہیے کہ ہر قسم کی تشبیہوں کا بخوبی استعمال کیا۔ انھوں نے اس کا بہت کم موقع دیا کہ اور شعرا بھی اس پر طبع آزمائی کریں۔ پس یہ لازم ہوگیا کہ کوئی بھی غزل‌گو شاعر جو اس رنگ میں قلم اٹھائے جدت پیدا کرے کیونکہ اگر وہ لکیر کا فقیر بن کر اسی قدیم طرز کو اختیار کرے گا تو اس میں نہ تو کوئی خوبی ہی ہوگی اور نہ لوگ اس کی قدر کریں گے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ جس کا ایک بار مطالعہ کیا جاچکا ہے اسی کا بار بار مطالعہ کرنے میں وہ لطف حاصل نہ ہوگا جب تک کہ اس میں کوئی نمایاں خصوصیت نہ ہو۔

جب ہم برق کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہیں یا کسی کی زبان سے ان کو سنتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے موجودہ زمانہ کے غزل‌گو شعرا کی روش اختیار کی ہے۔ آپ کی ابتدا کی شاعری میں جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، حسن و عشق کی چاشنی دی گئی ہے لیکن آگے چل کر اس میں حقائق و معارف، تصوّف اور فلسفہ کا بھی رنگ آگیا ہے۔ علاوہ ازیں تغزل کی شان بھی موجود ہے جو اردو شاعری میں ایک خاص اور اہم شے تصور کی جاتی ہے۔ آپ کی غزلوں کی تعداد قریب قریب اتنی ہی ہے جتنی کہ نظموں کی۔ اس میں ذرا بھی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ شاعر نے اپنے خیالات میں ایک خاص پرواز پیدا کی ہے۔ استعارات کا بر محل استعمال ہوا ہے۔ شاعر کا معیار حقیقتاً بہت بلند ہے۔ اپنے مطالب کو مشکل پیرایہ میں کہیں کہیں بیان کیا ہے جس کا آسانی سے سمجھنا دشوار ہوجاتا ہے۔ اتنا ہوتے ہوئے بھی آپ کو غزل گوئی میں وہ درجہ نہیں حاصل ہوا جس پر ناز کیا جاسکے۔ یا آپ اس حد تک نہیں پہنچے جس حد پر حضرات نظر لکھنوی، جگر مرادآبادی، فانی بدایونی، حسرت موہانی اور اصغر گونڈوی پہنچ چکے ہیں اور جو اس زمانے میں باعث فخر خیال کیے جاتے ہیں۔ ہم برق کی غزلوں کا مقابلہ شعرائے مذکورہ سے ہرگز ہرگز نہیں کرسکتے کیونکہ مقابلہ کرتے وقت ہمیں ایک خاص کمی محسوس ہوتی ہے۔

بہر کیف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ آپ کی نظمیں غزلوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ بلند پایہ رکھتی ہے۔ اب آپ کی غزلوں پر توجہ فرمائیے :-

ہم نہ کہتے تھے مریض غم کا حال اچھا نہیں
دیکھتے ہی غش تجھے اے چارہ ساز آہی گیا
عشق جب صادق ہوا تو بڑھ گیا عجز و نیاز
حسن جب کامل ہوا تو پھر ناز آہی گیا
کعبہ و بتخانہ کیوں مسجود ہونا چاہیے
لا تعین کس لیے محدود ہونا چاہیے
جوش ہمت کا تقاضا ہے یہ اک اک گام پر
صرف راہ منزل مقصود ہونا چاہیے

تیسرے اور چوتھے شعر میں کتنی بلند پروازی ہے۔ واقعی جو چیز لاتعین ہے اسے محدود کرنے سے کیا حاصل؟ اس لیے سجدے محض کعبے اور بتخانے ہی تک کوئی اہمیت نہ رکھیں گے۔ بقول بسمل الہ آبادی :-

"جس جا پہ جھکایا سر میں نے کعبہ تھا وہی بتخانہ تھا"

ہمت کا کیا تقاضا ہے، ہر ایک اس سے بخوبی واقف ہے۔ لیکن شاعر نے ہمت کی کیا تشریح کی ہے، یہ واقعی داد طلب ہے :-

مجھ سے سہواً بھی خطا ہو تو لرز جاتا ہوں
خون انصاف کا کرتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں
حسن اور حسن میں قائم ہے مراتب کا لحاظ
وہ جفا کرتے ہیں ہم شکر جفا کرتے ہیں

شاعر نے کیا مراتب کا لحاظ رکھا ہے۔ معشوق کی جفا پر شکر جفا کرنا عشاق کا خاصہ ہی ہے۔ اس شعر میں تغزّل کی شان پائی جاتی ہے۔

داغ الفت کا اجالا خانۂ دل میں رہے روشنی اس شمع کی تاریک منزل میں رہے
برق حسن یار اتنی کس لیے ہے بیقرار وہ میری آنکھوں میں ٹھہرے وہ مرے دل میں رہے

دم زدن میں ہوا عالم فانی کا سفر   کھل گیا راز کہ ہستی سے عدم دور نہیں
اس کے پرتو سے ہے جذبات کی دنیا آباد   آنکھ سے دور ہے وہ دل سے مگر دور نہیں

ایک شعر میں شاعر نے اپنے متعلق یا اپنے کلام کے متعلق کیا خوب فرمایا ہے:

گلزار میں ہے بلبل رنگیں نوا خموش   پھیکا ہے رنگ برق سخنداں کے سامنے

آپ نے درد و حسرت کا کتنا اچھا مرقع پیش کیا ہے:

حسرت آلودہ نگاہیں لب پہ ہے مہر سکوت
برق درد عشق کی تصویر خاموشی میں ہے

پھر آپ کیا فرماتے ہیں:

لذت گویائی مستور خاموشی میں ہے
ایک محویت کا عالم خود فراموشی میں ہے
کھیل قسمت کے زمانہ کی دو رنگی دیکھیے
کوئی صرف غم ہے کوئی شغل مےنوشی میں ہے
خود حجابوں سے نہاں ہے اور جلوے بےحجاب
حسن مطلق تیری روپوشی بھی روپوشی میں ہے

تیسرا شعر کس غضب کا اور کس قدر حقیقت و معرفت سے بھرا ہوا ہے۔ خدا تو پوشیدہ ہے لیکن اس کے جلوے نمایاں ہیں۔ شاعر نے کیا حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔

آپ کا یہ شعر:

نگہ سے جان لینا اور اشارے سے جلا دینا
کرشمہ تیرا اک یہ بھی ہے چشم پرفسوں وہ بھی

ہندی شاعر بہاری کے اس دوہے سے کتنی مطابقت رکھتا ہے:-

امی ہلاہل مد بھرے سویت سیام رتنار
جیت مرت جھک جھک پرت جیہ چتوت اکبار

آپ نے چند روزہ زندگی کا کیا صحیح نقشہ کھینچا ہے:

لیے ہیں ہستئی فانی میں سانس گنتی کے
شمار عمر دو روزہ تو کس حساب میں ہے

اب آپ کے حسب ذیل اشعار پر غور فرمایئے کتنے بلند ھیں:

دل جو صورت گر معنی کا صنم خانہ بنے
آنکھ جس شے پہ پڑے جلوۂ جانانہ بنے
تا در یار پہنچتا ھے وہ خود رفتۂ شوق
اپنی ھستی میں جو اس راہ سے بیگانہ بنے
ظرف مے ٹوٹ کے بھی ھونے نہ پائے بے کار
ھو شکستہ کوئی شیشہ تو پیمانہ بنے

پبلک میں آپ کی قدر تو تھی ھی، راج درباروں میں بھی آپ کی کافی دھاک جمی ھوئی تھی۔ وھاں بھی آپ کی عزت و خاطر و مدارات ھوتی تھی۔ ۱۹۱۱ء کے دلی دربار کے موقع پر پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے ان کو ایک قصیدہ پر جسے انھوں نے اس موقع کے لیے لکھا تھا چاندی کا تمغہ اور سرٹیفکٹ ملا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں والئی ریاست نرسنگھ گڑھ سے آپ کو انعام مل چکا ھے۔ آپ دو بار پٹیالہ دربار میں بھی بلائے گئے تھے۔ آپ کی خوبیوں کا کہاں تک ذکر کیا جائے۔

«خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں»

غالب

(از آل احمد صاحب «سرور» ایم-اے، شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی‌گڑھ)

شاعر کیا کہتا ھے، کس طرح سے کہتا ھے اور کس کے لیے کہتا ھے، نقد و نظر کی ساری تفصیل کا اجمال یہی ھے - غالب کی شاعری کا مطالعہ ھمیں اسی نقطۂ نظر سے کرنا ھے -

اس سے پہلے غالب کے متعلق بہت کچھ لکھا جاچکا ھے، اب بھی لکھا جارھا ھے اور شاید آئندہ بھی لکھا جائے، غالب کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل یہی ھے - اس قدر داد تحقیق و تنقید کے بعد بھی «حق تو یہ ھے کہ حق ادا نہ ھوا» - نئے نئے پہلو روز سامنے آتے رھتے ھیں اور ان کی روشنی میں غالب کے بہت سے بت بنتے اور ٹوٹتے رھتے ھیں - مگر موضوع ابھی فرسودہ نہیں ھے - اس میں ایک ابدی تازگی ھے - ایک ترشے ھوئے ھیرے کی طرح اس میں سیکڑوں پہلو ھیں - اس کی شعاعوں سے اھل نظر کا وھی عالم ھے جو پرتو خورشید سے شبنمستاں کا اس لیے ایک روشن اور واضح نقطۂ نظر کی تلاش ضروری ھے -

غالب نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ عجیب و غریب تھا - باھر آگ لگ رھی تھی اور گھر میں کسی کو خبر نہ تھی - سو پشت سے پیشۂ آبا سپہ‌گری تھا - خاندان کے مغل تھے اس لیے عیش امروز کو راحت فردا پر ترجیح دینا خمیر میں داخل تھا - باپ اور چچا نے ساری عمر لڑنے میں گزار دی، مگر کسی بلند نصب‌العین کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ پیشہ یہی تھا - غالب کا بچپن ننھیال میں بسر ھوا - شروع میں بہ تقاضائے سن خوب رنگ رلیاں کیں - اس زمانے کا ذکر انھوں نے بڑے

مزے لے لے کر کیا ہے - زوال آمادہ شرفا میں جو جو باتیں ہوتی ہیں غالب میں اس وقت سب موجود تھیں۔ دنیا کے لذائذ سے متمتع ہونا، اپنی ذات کو آگے رکھنا، اپنی دنیا الگ بنانا غالب نے اپنے ماحول سے سیکھا۔ شاعری کا ذوق رسمی نہ تھا، فطری تھا، ورنہ غالب غالب نہ ہوتے۔ ملا عبدالصمد سے انھوں نے فارسی پڑھی اور اس میں وہ ملکہ پیدا کرلیا کہ زبان‌دانوں کی ہمسری کرنے لگے۔ فارسی کے اس ذوق نے اور طبیعت کی افتاد نے "بیدل" کی طرف مائل کیا - بیدل عوام کا شاعر نہیں - غالب اس عمر میں بھی شاہراہ عام سے ہٹ کر چلنا چاہتے تھے - اپنی برتری کا احساس، حسب نسب پر فخر، عوام سے علیحدگی کی خواہش، یہ سب باتیں شروع سے ان میں موجود تھیں - طبیعت فلسفہ کی طرف مائل تھی کیوں کہ تحلیل و تجزیہ کی قوت خدا کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی اور تحلیلی انداز طبیعت کا قدرتی نتیجہ فلسفہ دانی ہے - غرض غالب نے جب شاعری شروع کی تو بیدل کا رنگ اختیار کیا - فارسی ترکیبیں، فارسی انداز بیان، نازک خیالی بلکہ خیال بندی مصنوعی اور بعض جگہ بےکیف دماغی ورزش ان سب کا پتہ پہلے دور کی شاعری میں ملتا ہے، لیکن یہ کہہ کر اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ غالب نے بہت جلد اس روش کو ترک کردیا اور نسخہ حمیدیہ میں ۱۸۲۱ع سے پہلے کے اشعار کی جو فہرست ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی کتنی غزلیں اس عمر میں ایسی کہہ چکے تھے جن میں وہ بیدل کی غلامی سے آزاد نظر آتے ہیں، لیکن یہ مشق غالب کے لیے ہر لحاظ سے مفید ثابت ہوئی۔ معنی آفرینی اور نازک خیالی کی کوشش جو آگے چل کر متاخرین شعرائے فارسی کے ڈھب پر ہوئی، یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ لفظ تراشی اور خلاقی فکر جس نے آگے چل کر بڑے بڑے گل کھلائے ہیں، پہلے پہلے یہیں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں اس پر مصنوعی اور پرتکلف انداز بیان کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور آگے چل کر اس سے نفسیاتی حقایق کی تشریح میں مدد لی گئی ہے۔

ادھر غالب کو اس وادی بےراہ کی کوتاہیوں کا احساس ہوا ادھر "ظہوری نے ان کے بازو پر تعویذ اور کمر پر زاد راہ باندھا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا

انھیں سکھایا"۔ تیموری دور کے متاخرین شعرائے فارسی سے غالب بہت متاثر ہوئے ہیں خصوصاً نظیری سے ۔ بیدل کی تقلید میں غالب خیالی مضامین تو باندھتے تھے مگر ان میں مصنوعی رنگ ہوتا تھا ۔ ان شعرا کی نازک خیالی و معنی آفرینی تغزل میں سمو کر انھوں نے لفظ اور معنی کا ایک نیا رشتہ دکھایا اور اپنے خاص رنگ تک انھیں کی دست گیری سے پہنچے ۔

اردو شعرا میں وہ میر اور ناسخ سے متاثر ہوئے ۔ آخر آخر میں باوجود اس قدر اظہار نفرت کے ذوق کا رنگ بھی ان کے کلام میں جھلکتا ہے ۔ میر کا اثر غالب پر بہت اچھا پڑا ۔ ان کی سادگی و پرکاری' میر کے رنگ میں ہے ۔ اس میں وہ سادگی' گھلاوٹ' سوز و گداز اور صداقت شعری موجود ہے جس کی وجہ سے میر کے نشتر مشہور ہیں ۔ میر کا فلسفۂ غم غالب کے فلسفۂ غم سے الگ ہے ۔ میر کے رنج و الم میں اگرچہ ایک مریض کی سی کیفیت ہے مگر اس کی بنیاد صداقت پر ہے ۔ غالب کا رنج و الم ایک قسم کی دماغی عیاشی ہے ۔ میر کی زندگی حسرت و حرماں میں گزری مگر غالب نے اپنی زندگی کے لیے حسرت و حرماں پیدا کیا ہے ۔ نتیجہ ظاہر ہے ۔ ناسخ کا اثر غالب پر منفی (Negative) ہے ۔ ناسخ اور ان کے ہوا خواہوں نے رعایت لفظی اور مثالیہ شاعری کے شوق میں جو بے اعتدالیاں کی تھیں غالب نے ان سے اپنا دامن بچایا ۔ ناسخ کا یہ رنگ شاہ نصیر کے واسطے سے دہلی تک پہنچا ۔ شاہ نصیر دہلی کے ناسخ ہیں ۔ ذوق' مومن' غالب تینوں نے یہیں سے رعایت لفظی کا شوق سیکھا ۔ مومن اور ذوق بہت دن اس کوچے میں رسوا ہوئے مگر غالب آگے بھی تو اس لیے کہ اس کی لغزشوں سے بچے رہیں ۔

ذوق :- پھرتا ہے سیل حوادث سے کہیں مردوں کا منہ
شیر سیدھا تیرتا ہے وقت رفتن آب میں

مومن :- یاد آیا سوئے دشمن اس کا جانا گرم گرم
پانی پانی ہوگیا میں موج دریا دیکھ کر

غالب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں رعایت لفظی ضرور ہے مگر غور طلب امر

یہ ہے کہ کچھ اور بھی ہے یا نہیں :

ستائش گر ہے زاھد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا
بیاں کیا کیجیے بیداد کاوش ھائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

اس کے علاوہ ان کی «آبھی نہ سکوں» «جابھی نہ سکوں» والی غزل کو بھی ملحوظ رکھا جائے تو معلوم ھوتا ہے کہ ان میں اور ذوق میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ درباری دور میں غالب ذوق سے بھی متاثر ھوئے ۔ وہ دیکھتے تھے کہ ذوق کا رنگ مقبول ہے ۔ اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ کیوں ۔ انھیں محاورۂ ھندی سے نفرت تھی مگر غیر ارادی طور پر ان کے آخری دور میں رعنائی خیال کی بجائے لطف زبان زیادہ آگیا ہے ۔ «اڑتی سی اک خبر ہے زبان طیور کی» اس کی ایک مثال ہے اور ایسی مثالیں اور بھی ھیں ۔

یہ ھیں وہ مختلف اثرات جو غالب کے یہاں ملتے ھیں ۔ ان سب کی رنگ آمیزی غالب کے کلام میں اپنی بہار دکھاتی ہے مگر یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاھیے کہ غالب مقلد نہیں ۔ ان کا اپنا رنگ ہے ۔ ھاں اس کی تعمیر جن متفرق عناصر سے ھوئی ہے ان کا ذکر ایک جگہ ضروری تھا ۔ اب ایک اور بات پر غور کرنا ہے ۔

اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے کہ غالب کس کے لیے کہتے تھے ۔ جہاں شاعری ذاتی جذبات کا نام ھو وھاں اور کچھ کہاں سے آئے ۔ غالب کا خیال شعر و شاعری کے بارے میں کیا تھا ، وہ اپنے خطوط میں جابجا لکھتے ھیں ۔ « شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں » ۔ کبھی بتاتے ھیں کہ اس قوم کے شعرا کے یہاں « چیزے دگر » کا بھی پتہ ملتا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ھوتا کہ وہ شاعری کیوں کرتے تھے ۔ اگر ان سے یہ سوال کیا جاتا تو شاید وہ اتنے ھی سراسیمہ ھوتے تھے جتنے کہ شہریار یا شہزاد ھوتے اگر ان سے دریافت کیا جاتا کہ « افسانہ » کسے کہتے ھیں ۔ میر نے تو اس سوال کا موقع ھی نہیں آنے دیا ۔ فرماتے ھیں :

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

حسرت و حرماں کا وہ بھاری بوجھ جسے میر اپنی زندگی کہتے تھے کیسے برداشت ہوتا۔ اقبال سے اگر یہی سوال کیا جائے تو وہ کڑک کر یوں جواب دیں گے کہ شاعر دیدہ بینائے قوم ہے اور :

مبتلائے رنج کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

مگر غالب کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ مشاہدۂ حق کی گفتگو کو بادہ و ساغر کہے بغیر نہ بنے مگر مشاہدۂ حق کی گفتگو تو صرف اسالیب سے تعلق رکھتی ہے نفس موضوع سے نہیں، اس کا تو اگر کوئی جواب ہے تو یہی ہے کہ :

اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

دوسرے الفاظ میں غالب شعر اس لیے کہتے تھے کہ کہہ سکتے تھے۔ وہ شعر اپنے لیے کہتے تھے اور اپنے تاثرات کے اظہار کے لیے کہتے تھے۔ اس میں ان کے سخن فہم دوست بھی شامل تھے اور بس۔ والٹر سیوج لینڈر نے ایک جگہ لکھا ہے :

"There is joy in singing
When none hear beside the singer"

براؤننگ اور غالب دونوں کے دل میں ایسا ہی کوئی خیال ضرور تھا۔ جب ہی تو غالب کہتے ہیں :

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

غالب نے اپنے کلام سے فائدہ اٹھانے کی بھی کوشش کی۔ بہادرشاہ، نصیرالدین حیدر، واجدعلی شاہ، آصف‌جاہ، انگریز ریزیڈنٹ، سکتر، ملکہ وکٹوریہ، گورنر جنرل ان سب کے غالب نے قصیدے لکھے اور ان سے امید بھی تھی کہ کچھ نہ کچھ حاصل ہوجائے مگر اس میں بھی انھوں نے کہیں اپنی شاعری کو ذلیل نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ اپنی توہین کی۔ وہ انگریزوں کی مدح میں جو قصیدے لکھتے تھے ان میں بھی وہی کاوش

کرتے تھے جو بہادر شاہ کے قصائد میں اور پھر زور مدح اور ستائش پر نہیں ہوتا تھا بلکہ عرض حال اور تشبیب پر۔ مرزا تفتہ کو انھوں نے لکھا ہے کہ فارسی شعرا کی سی بھٹئی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں۔ « قصائد کی تشبیب میں تو مں بھی جہاں عرفی و انوری پہنچتے ہیں افتاں و خیزاں پہنچ جاتا ہوں مگر مدح و ستائش میں مجھ سے ان کا ساتھ نہیں دیا جاتا » ۔ غالب ایک دنیا دار آدمی تھے۔ قناعت ان میں نہ تھی۔ وہ اپنے کمال سے شہرت اور منفعت دونوں حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کوین پوئٹ اور ملک‌الشعرائی کی خواہش اسی وجہ سے تھی۔

یہ طے کرنے کے بعد کہ وہ کس کے لیے کہتے تھے، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا کہتے تھے۔ حالی کی رائے ہے کہ شاہراہ عام سے بچنے کی خواہش میں وہ گمراہ نہیں ہوئے۔ میر کی پیشین گوئی سب کو معلوم ہے۔ غالب نے کس نئی صنف سخن کی بنیاد نہیں ڈالی، نہ کوئی نیا موضوع اردو شاعری کو بخشا۔ انھوں نے جو تصرفات کیے وہ معنوی ہیں۔ جس حالت میں انھوں نے اصناف سخن کو پایا ویسا ہی چھوڑا۔ ان میں صورت کے لحاظ سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ انھوں نے شعر و شاعری کی اندرونی دنیا میں انقلاب کردیا مگر بہ ظاہر اس کی صورت وہی رہی۔ ان کی مینا وہی ہے مگر شراب دوسری ہے۔ غزل جو ابتدائے شاعری کی محبوب ترین صنف تھی ان کی بھی منظور نظر رہی۔ انھوں نے قصیدے بھی لکھے مثنویاں بھی لکھیں، قطعات و رباعیات بھی لکھیں، تاریخیں بھی نکالیں اور مرثیہ بھی لکھا۔ شہدائے کربلا کا مرثیہ نہیں بلکہ ذاتی حوادث پر مرثیہ۔ ایک اپنے کسی محبوب کے مرنے پر، دوسرا عارف کی موت پر۔ غرض انھوں نے سب اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مگر سب میں جدّت پیدا کی۔ ان سے پہلے شعرا کی ساری کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مضامین فارسی میں اچھی طرح نظم ہوچکے ہیں وہی زیادہ بلند طور پر نظم کردیے جائیں۔ انھوں نے یہ بھی کیا مگر اپنی عمارت کی بنیاد دوسری چیزوں پر رکھی۔ اپنے ذاتی جذبات اپنے ذاتی نقطۂ نظر سے بیان کیے۔ ان کے اظہار میں انفرادیت کو ملحوظ رکھا۔ کائنات کی وسیع فضاؤں میں سے ایک گوشہ انھوں نے اپنے لیے پسند کیا۔ وہ جین آسٹن یا پروسٹ کی طرح ساری

عمر Miniature Painting کرتے رہے مگر اپنے دائرے میں اس کا جواب نہیں ہوسکتا.
یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں ہے ۔ اس دائرے میں غالب نے جو کچھ لکھا ہے وہ گویا ان کے تمام تجربات کا نچوڑ ہے اس میں زندگی کا ہر تار بیدار یا خوابیدہ موجود ہے اور فلسفہ، تصوف، نفسیاتی حقائق، ظرافت سب کا عکس یہاں ملتا ہے ۔ ان پر تفصیلی بحث آگے چل کر کی جائے گی ۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ وہ کس طرح کہتے تھے اور چونکہ ادب میں سارا کھیل کہنے کے انداز کا ہے اس لیے غالب کے کلام کی تمام خصوصیات اسی ذیل میں دیکھنی ہیں۔ مرزا سے پہلے رجحان یہی تھا کہ جو چیزیں بیان ہوچکی ہیں وہ زیادہ سادگی و صفائی سے بیان کی جائیں۔ محاورہ بندی کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی وہ اسی وجہ سے تھی ۔ لیکن غالب کے کلام میں محاورہ نہیں پایا جاتا۔ اب بعض اشخاص اسے شعر کی جان سمجھتے ہیں اور جب تصوف، فلسفہ، سوز و گداز، لطافت، نزاکت اور اس قسم کے دوسرے رسمی عنوانات کے تحت میں کسی پر تنقید ہوتی ہے تو محاورہ بندی کو خاص اہمیت دی جاتی ہے ۔ ذوق کی شاعری، محاورات و امثال سے بھری ہے مگر ذوق کے اچھے شعر اپنے محاوروں کی وجہ سے مشہور نہیں ہیں ۔ داغ کی وہ شاعری جو زندہ رکھنے والی ہے اس زمانہ سے پہلے کی ہے جب انھیں ہر محاورہ کو نظم کردینے کا خیال پیدا ہوا تھا ۔ محاوروں کی وجہ سے شعر بلند نہیں ہوتا۔ ہاں اگر اس میں کوئی صداقت شعری ہے تو محاورہ اسے چمکا دیتا ہے۔ دراصل محاورہ بندی شعرا کے لیے اتنی مفید نہیں جتنی تشبیہات و استعارات کی فراوانی ۔ تشبیہات و استعارات اسی لیے شعر میں استعمال ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعے سے معنی آفرینی، حسن آفرینی اور اختصار تینوں کا حق ادا ہوجاتا ہے ۔ نئی زبان استعارات سے بنتی ہے ۔ کم از کم اس کے سانچے ضرور اس سے تیار ہوتے ہیں ۔ خیال کو نئی نئی راہیں ملتی ہیں، ذہنی فضا میں اضافہ ہوتا ہے ۔ زبان آگے قدم بڑھاتی ہے ۔ عام طور پر تمام شعرا دو گروہوں میں منقسم ہوجاتے ہیں۔ ایک وہ جو زبان کو محفوظ کرنے والے ہیں۔ دوسرے وہ جو زبان کو آگے بڑھانے والے ہیں ۔ یہاں زبان سے عوام کی بولی مراد

نہیں، بلکہ وہ زبان جو ادیب اور شاعر اپنے اظہار خیال کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ دونوں کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ورنہ ریختی گو شعرا کو کوئی ٹکے سیر بھی نہ پوچھتا۔ میرے خیال میں زبان کو آگے بڑھانے والوں کی اہمیت زیادہ ہے۔ غالب اسی گروہ کے سرخیل ہیں۔ انھوں نے صنائع بدائع استعمال نہیں کیے بلکہ اظہار خیال کے لیے نئے نئے اسلوب نکالے۔

«غالب کے قصر شاعری کی بنیاد جدت طرازی پر ہے»۔ اس جدت طرازی میں جدت تخئیل، جدت طرز ادا، جدت استعارات، جدت تشبیہات، جدت محاکات، جدت الفاظ سب آجاتے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہے کہ نئے خیالات کم ہوتے ہیں، یا تو پچھلے خیالات میں اضافہ کرکے داد ایجاد دی جاتی ہے، یا خیال کے ایک پہلو کو بدل کر دوسرا پیش کیا جاتا ہے یا دو مختلف خیالات کی ترتیب و امتزاج سے ایک نیا پیکر خیالی پیدا کیا جاتا ہے۔ غالب نے یہ سب کچھ کیا ہے اور اس کے علاوہ اکثر پرانے خیال کو اپنی جگہ رکھ کر طرز ادا سے اس میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ جدت ادا بھی اظہار خیال کی ترتیب یا بیان کا پیرایہ بدل دینے سے ہوتی ہے اور کبھی نئی تشبیہات و استعارات سے صہبائے کہن کو نئے شیشوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ بہت سی مثالوں کی ضرورت نہیں اس لیے کہ حالی، بجنوری اور دوسرے ناقدین نے اس پہلو پر کافی زور دیا ہے، چند پر اکتفا کی جاتی ہے:—

جدت تخئیل:—

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز — دعا قبول ہو یا رب کہ عمر خضر دراز

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے واں بھی خانہ آرائی — سفیدی دیدہ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں میں

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام — مہر گردوں ہے چراغ رہگزار بادیاں

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے — خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

جدت ادا:—

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

پوچھ مت وجہ سیہ مستی ارباب چمن سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موج شراب
بوئےگل، نالۂدل، دود چراغ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
وفور اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ کہ ہوگئے مرے دیوار و در در و دیوار
آرایش جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیش نظر ہے آئینہ دایم نقاب میں
دھر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے، اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

جدت تخئیل اور جدت ادا کے علاوہ غالب کی ترکیبوں اور تشبیہوں کی جدت بھی اہم ہے - اکرام کا خیال ہے کہ " مرزا تشبیہات و استعارات کے بادشاہ ہیں - ساری دنیا کی شاعری میں ان کی مثال ملنی مشکل ہے "- لطیف جیسا معترض بھی یہ تسلیم کرتا ہے : " بہ حیثیت ایک لفظی صنعتگر کے غالب تمام اردو شعرا میں ایک بلند مرتبہ پر فائز نظر آتا ہے " - غالب کی تشبیہات و استعارات میں تشبیہات و استعارات کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں - معنی آفرینی، حسن آفرینی اور اختصار تینوں کی جھلک یہاں ملتی ہے - ان کی ترکیبیں بعض وقت ایک ایسے وسیع خیال کا چند لفظوں میں احاطہ کرلیتی ہیں جو بیان کیا جائے تو کئی سطروں میں ادا نہ ہو - حقیقت یہ ہے کہ غالب نے ایک نئی زبان ایجاد کی، خیالات کے نئے سانچے بنائے اور نئی روشوں کی بنیاد ڈالی - تشبیہات و استعارات کی خاطر کہیں غالب نے شعر کی روح کا خون نہیں کیا - ہمیشہ اس سے خلاقی و حسن آفرینی میں مدد لی اور یہی مرزا کی مناسبت طبعی کی دلیل ہے - ان کی ترکیبیں کہیں کہیں ظرافت لیے ہوئے ہیں - ابتدائی دور میں یہ بیدل کے اثر سے استعمال ہوئی ہیں - بیضۂ طاؤس، بال طپیدن، کاغذ آتش زدہ، دام خیال، غبار شہر، یک الف بیش، یک الف کم کے علاوہ بجنوری نے ایک طویل فہرست دی ہے جن میں سے چند ملاحظہ ہوں - دام شنیدن، آتش خاموش، موج نگاہ، خودداری ساحل، دریائے بیتابی، وادی خیال، جنت خیال، فردوس گرش - تشبیہات کی بھی بجنوری نے ایک طویل فہرست دی ہے - ان میں سے بعض بہت دلچسپ ہیں - چنانچہ بہار کو حنائے پائے خزاں سے، تسبیح کو دل صد عشاق سے، جوہر آئینہ کو طوطی بسمل سے، دام موج کو حلقہ صد کام نہنگ سے، تار اشک کو رشتۂ چشم سوزن سے، مماثل بیان

کرکے غالب نے الفاظ کو معانی کا پورا پورا بوجھ اٹھانے پر مجبور کردیا ہے۔ "آبگینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے" ۔ ان کی لفظ تراشی ، ان کی تشبیہات ، سب ان کی قادرالکلامی کا پتہ دیتی ہیں ۔ وہ الفاظ سے اس طرح کھیلتے ہیں جس طرح کوئی ماہر فن اپنے مسالے سے ۔

غالب کی اس خصوصیت کی طرف تو توجہ بھی کی گئی ہے۔ لیکن جس چیز کی طرف کم توجہ ہوئی ہے وہ غالب کے مسلسل اشعار ہیں ۔ غزل کے خلاف یہ اعتراض ظاہر ہے کہ اس میں ایک شعر کو دوسرے سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا اور جو تصویر سامنے آتی ہے وہ منتشر، پریشان اور بےربط جذبات کی تصویر ہے ۔ اس اعتراض میں بہت کچھ صداقت ہے چنانچہ اسی دور میں بعض شعرا نے کوشش کرکے مسلسل غزلیں لکھی ہیں جن میں "جوش" کا نام قابل ذکر ہے ۔ رسالہ کلیم میں اردو غزل گوئی پر بہت سے اعتراضات کیے گئے تھے مگر ان میں اس بات کو فراموش کردیا گیا تھا کہ اردو کے تمام ممتاز شعرا اور خصوصاً غالب کے یہاں مسلسل اور مربوط تصویریں اکثر ملتی ہیں ۔ ان کی غزلوں میں اکثر قطعات موجود ہیں اور اس کے علاوہ بہت سی غزلیں ایک مضمون کی ہیں ۔ بعض کے اشعار میں کوئی نہ کوئی معنوی مناسبت پائی جاتی ہے اور بعض میں اچھے خاصے قطعات نظم ہوئے ہیں ۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

شب ہجوم سوز دل سے زہرۂ ابر آب تھا ۔۔۔ شعلۂ جوالہ ہر اک حلقہ گرداب تھا

نالۂ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا ۔۔۔ تھا پسند بزم وصل غیر بے تاب تھا

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب ۔۔۔ دے بط مے کو دل‌ودوست شنا موج شراب

غیر یوں کرتا ہے مری پرسش اس کے ہجر میں ۔۔۔ بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غم‌خوار دوست

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد ۔۔۔ بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور ۔۔۔ تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

وہ فراق اور وہ وصال کہاں ۔۔۔ وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

هرچند جاں گدازی تیر و عتاب ہے　　هر چند پشت گرمی تاب و تواں نہیں

دایم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں　　خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو　　ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

درد سے میرے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے　　کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے　　سینہ جویائے زخم کاری ہے

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل　　زنہار اگر تمہیں ہوس نائے و نوش ہے

پھر اس انداز سے بہار آئی　　کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

بہ قدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل　　کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

اس کے علاوہ ان غزلوں میں چاہے ردیف کی مناسبت سے ہی کیوں نہ ہو ایک معنوی تعلق ملتا ہے:

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی قابو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

کوئی امید بر نہیں آتی　　کوئی صورت نظر نہیں آتی

ابن مریم ہوا کرے کوئی　　میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے　　ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ان اشعار سے اگر ہم چاہیں تو غالب کے عشق و محبت کی ایک مسلسل داستان مرتب کرسکتے ہیں۔ ان میں عشق کے ابتدائی مراحل کا بھی ذکر ہے اور اس کی بازگشت کا بھی ۔ شب فراق کی کیفیت بھی ہے اور وصل کی یاد بھی اور حسن و عشق دونوں کا مرثیہ بھی ہے ۔ مگر اس تصویر خیالی کی تمام جزئیات بیان کرنا ایسا ہی ہوگا جیسا غالب کے مختلف اشعار سے فلسفہ، تصوف اور ارتقا کا ایک مکمل نظریہ مرتب کرنا۔ بہر حال مسلسل اشعار کی ایک اور خصوصیت ہے جو کلام میں عام طور پر ملتی ہے۔ یہ جوش بیان ہے جن کی وجہ سے صاحب شعرالہند غالب کو حافظ کے ہم‌پایہ قرار دیتے ہیں۔ ایک مضمون بیان کرنے میں تو یہ جوش قدرتی طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ بعض جگہ مختلف اشعار کے باوجود ان کی پوری پوری غزلوں میں بیان کی وجہ سے شعر اعجاز کے درجہ کو پہنچ گیا ہے ۔ ایک غزل کے چند اشعار دیکھیے:

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراق تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں اٹھیے بس اب کہ لذّت خواب سحر گئی

دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا موج خرام ناز بھی کیا گل کتر گئی

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہےگا میری گردن پر
وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بےآبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

ذرا کر زور سینے پر کہ تیر ہر ستم نکلے
جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

نہ اتنا بُرش تیغ جفا پر ناز فرماؤ
میرے دریا کی بیتابی میں ہے اک موج خوں وہ بھی

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیٔ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دور ساغر کی

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقد فتنہ محشر نہ ہوا تھا

یہ مثالیں محض یادداشت سے لی گئی ہیں ورنہ ایسے اشعار کی تعداد بہت ہے جہاں شاعر بہت جوش سے اظہار خیال کرتا ہے ۔ اس کے علاوہ جہاں بندش خاص طور پر چست ہوگئی ہے اور دونوں مصرعوں میں ایک توازن پایا جاتا ہے وہاں شعر موسیقی کے لحاظ سے بھی بلند ہوجاتا ہے :۔

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی قابو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

لاف تمکیں فریب سادہ دلی ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم دُرد یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

غالب کے کلام کی ایک اور خصوصیت ہے جو اگرچہ اچھے شعرا کے یہاں عموماً چاہیے لیکن جس کثرت سے غالب کے یہاں ملتی ہے دوسری جگہ نہیں، یہ ہے کی بلاغت۔ بلاغت محض ایجاز و اختصار یا محذوفات کا نام نہیں بلکہ یہ دریا زے میں بند کردینے کا دوسرا نام ہے۔ غالب اپنے دل کے اندر ایک حشر جذبات ے ہوئے تھے، خیالات کا ہجوم تھا اور الفاظ خیالات کے لیے رہنمائی کا کام تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر دو مصرعوں کی چھوٹی سی دنیا میں ایک جہان آباد ہے۔ کہیں تو تشبیہات و استعارات سے اس بلاغت کے لطف کو دوبالا کیا ہے ہیں سیدھے سادے الفاظ میں وسیع سے وسیع مضامین کا احاطہ کرلیا ہے:-

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

غالب تیرا احوال سنا دیں گے ہم اس کو
وہ سن کے بلالے یہ اجارا نہیں کرتے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسبان کے لیے

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

کہا تم نے کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اس قسم کے اشعار میں خوبی یہ ہے کہ جو کچھ کہا ہے اس سے زیادہ تخیل کے لیے جگہ چھوڑی ہے۔ یہ اور چیز ہے اور وہ محذوفات دوسرے ہیں جو اس قسم کے اشعار میں پائے جاتے ہیں:-

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

مومن کے محذوفات بھی باوجود دل کش ہونے کے اسی قسم کے ہیں :-

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

عدو اس اوج پرشاکی ہے شاید غصہ آجائے ملادے خاک میں یہ تو بھی شکر امتحاں کیجے

غالب کے تصوف اور فلسفہ پر بہت زور دیا گیا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس دور میں ان کی مقبولیت کا باعث یہی ہے ۔ یہ خیال بالکل صحیح نہیں ۔ غالب کی مقبولیت کا باعث ان کا تکلف نہیں بلکہ اس کے نفسیاتی حقایق ہیں ۔ وہ نہ فلسفی تھے نہ صوفی ۔ ان کی طبیعت فلسفیانہ مضامین کی طرف ایک خاص وجہ سے مایل تھی اور تصوف سے دلچسپی بھی اسی ذیل میں آتی ہے ۔ ان کا سارا فلسفہ اور تصوف ان کے فکر روشن کی کرشمہ سازی کا نام ہے ۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ۔ ان کے کلام سے فلسفہ اور تصوف کے جو مسلسل مضامین اخذ کیے جاتے ہیں وہ وہاں نہیں ۔ دیکھنے والے اپنا عکس ان میں دیکھتے ہیں ۔ شاعر کی تخلیقی قوتیں پڑھنے والوں کی تخلیقی قوتوں کو حرکت میں لاتی ہیں اور یہ پڑھنے والے اپنے رجحانات کے مطابق اس میں کوئی حسین خیال ، کوئی اخلاقی نظریہ کوئی فلسفیانہ رمز پاتے ہیں ۔ شعر تو دیا سلائی ہے جس سے پڑھنے والوں کی آتش بازی چھوٹتی ہے ۔ یہاں ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا --- غالب نے مادّہ ، ہیولیٰ ، آفرینش ، ارتقا کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ ان کا اپنا نظریہ نہیں ۔ انھوں نے مختلف خیالات و نظریات کو شعر کے پردے میں بیان کیا ہے ۔ ان میں ایک ربط دیکھنا لاحاصل ہے ۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی فلسفۂ زندگی بھی نہ تھا جسے وہ اپنی غزلوں میں پیش کرنا چاہتے ہوں ۔ وہ نہ قنوطی تھے نہ رجائی نہ پیغامبر تھے نہ قوم پرست ۔ ان کے کلام میں رنج و الم کی جو فراوانی ملتی ہے وہ کہیں تو ان کی ذاتی مایوسیوں کا پرتو ہے اور کہیں محض ایک آلۂ خیال (Fad) ۔ ان کے خاص خاص رجحانات ان کے کلام سے نہیں ، ان کے خطوط سے اخذ کیے جاسکتے ہیں ۔ یہ ضرور ہے کہ بعض مضامین کی تکرار سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یہ ان کے مستقل تاثرات ہیں لیکن ان کی بھول بھلیاں میں ایک

واضح نقطۂ نظر کی کارفرمائی نہیں ملتی ۔ ان کی فطرت رجائی تھی اور ان کا ماحول قنوطی ، ذہنی زندگی میں کئی تلخ حقایق سے دو چار ہونا پڑا تھا ۔ ان کے کلام میں اس کی کشمکش ضرور ملتی ہے مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں ۔

غالب صوفی نہ تھے ۔ انھیں تصوف کے اس حصہ سے ضرور دلچسپی تھی جہاں مومنین مختلف ملتوں کو مٹا کر ایمان کامل کی بنیاد ڈالتے ہیں ، لیکن یہاں تک وہ اپنی آزاد منشی کی وجہ سے پہنچے تھے ۔ صوفیوں کے راستے نہیں ۔ وہ جس وجہ سے فرہاد کی تنگ ظرفی پر طنز کرتے تھے اسی وجہ سے بہشت پر استہزا کرتے ، یہ سب ان کی بڑھی ہوئی خودی یا انانیت کا نتیجہ تھا اور اس میں سب سے الگ اپنا راستہ بنانے کی خواہش بھی شامل تھی ۔ مگر غالب کی یہ خوبی ہے کہ وہ ایک جام جہاں‌نما ہے اور اس کے کلام کی ایک سے زیادہ تفسیریں ہوسکتی ہیں ۔

یہاں جس خصوصیت پر زیادہ زور دینا ضروری ہے وہ غالب کی نفسیاتی گہرائی اور اس کی ظرافت طبعی ہے ۔ ان دونوں میں ایک اندرونی رشتہ بھی ہے ۔ اکرام نے ٹھیک لکھا ہے کہ اسی نفسیاتی ژرف بینی کی وجہ سے غالب غالب ہوئے ۔ ابتدا میں بیدل کی تقلید نے اس جوہر کو ابھرنے نہ دیا مگر اس رنگ سے بیزاری کی اصل وجہ یہ تھی کہ غالب اب فطرت انسانی کے نباض ہوگئے تھے اور انھیں بیدل کی خیالی اور مصنوعی دنیا سے دلچسپی کم ہوگئی تھی ۔ بیدل کی خلاقی سے انھیں ہمیشہ دلچسپی رہی ۔ اس دور میں نفسیاتی حقایق سے خاص طور پر دلچسپی ظاہر کی جاتی ہے ۔ یہی اس دور کا کارنامہ ہے ۔ اس لیے غالب کی نفسیاتی گہرائی خاص طور سے مقبول ہے ۔ غالب نے مناظر قدرت کی تصویریں نہیں کھینچی ۔ انھوں نے صبح ، شام ، رات ، گرمی ، جاڑا ، برسات ، ریچھ ، بندر ، ہولی ، دوالی کی کیفیات کو نظم نہیں کیا ۔ انھوں نے عاشق کے دل کی حالت اور معشوق کی اندرونی کیفیت نظم کی ۔ انھوں نے قلب کے اندر گھس کر دل کی گہرائیوں کو ٹٹولا اور جذبات انسانی کی پردہ‌دری کی ۔ وہ خارجی حالات کے مصور غم نہیں ، داخلی کیفیات کے مصور ہیں اور اس کی انھوں نے زندۂ جاوید مثالیں پیش کی ہیں :—

دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدعا پایا　　کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا

دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا　　جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی

زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا　　احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا　　کی مرے قتل کے بعد اس نے جفائے توبہ

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا　　اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا

لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا　　گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف بر طرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعث افزائش درد دروں وہ بھی

تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے　　مت پوچھ کہ کیا حال ہے تیرا مرے پیچھے

دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچیے　　عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر

اشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطف خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

اس نفسیاتی گہرائی کی وجہ سے ان میں وہ لطافت یا شگفتگی طبعی پائی جاتی ہے جو ظرافت کی اساس و بنیاد ہے ۔ حالی غالب کو مرد ظریف کہتے ہیں ۔ بجنوری

کے خیال میں غالب کے لب ہنسی سے نا آشنا لیکن ہنسی صرف « بربنجی قہقہہ » کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتی - یہ وہ چیز ہے جس سے سارا کلام دوآتشہ بن جاتا ہے بجنوری کہتے ہیں کہ «جو شخص زندگی کو دور سے دیکھتا ہے اور خود بے پروا رہتا ہے وہ ہنستا ہے اور جو قریب سے دیکھتا ہے وہ اس میں شریک ہوتا ہے ' وہ نہیں ہنستا ۔ غالب کی طبیعت میں رحم ہے ' وہ انسانی کمزوریوں پر لب آسا ہنستے نہیں بلکہ چشم آسا روتے ہیں » ۔ اس خوش عقیدگی کا کوئی علاج نہیں ۔ ہنسنے کے لیے بے پروائی ضروری نہیں ' صرف ذرا بلندی ضروری ہے - اور یہ وہ بھی حاصل کرسکتا ہے جو زندگی میں شریک ہو ' غالب کے یہاں یہی بلندی (Aloofness) ملتی ہے۔ بار الم اور رنگ نشاط اٹھانے کے بعد «اصغر» بےحسی کا شکار ہوئے ' مگر غالب نے یہ سیکھا کہ سختی و سستی ' رنج و الم سب کو ہموار کریں ۔ انھوں نے اپنے محبوب کی وفات پر جو مرثیہ لکھا ہے اس کا مقابلہ اگر عارف کے مرثیے سے کیا جائے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ غالب نے شعور فنی کے ساتھ نفسیاتی ژرف بینی اور اس کی وجہ سے ایک خاص قسم کی ظرافت میں کتنی ترقی کی تھی - وہ قوی احساسات و جذبات کے مالک تھے ' لیکن ان کی فہم و دانش اس سے بڑی قوی‌تر تھی - وہ جانتے تھے کہ :

تاب لائے ہی بنے گی غالب واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

وہ جذبات کی رو میں بہ کر اپنا دماغی توازن کھو نہیں بیٹھتے تھے ۔ جوں جوں ذہنی زندگی کے نشیب و فراز سے آگہی ہوتی جاتی تھی' جن واقعات پر وہ آنسو بہاتے تھے اب صرف مسکرا دیتے ' ان کی شوخی کی اصلی بنا ان کی جدت طرازی اور بات میں بات پیدا کرنے کی عادت تھی اور وہ اپنے متعلق بھی اشارے کیے بغیر نہ رہتے تھے :

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل‌لگی سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

حالی اور بجنوری نے ان کے پہلودار اشعار پر بہت زور دیا ہے - حالی نے غالب کی چار خصوصیات بتائی ہیں - جدت مضامین و طرفگی خیالات ، تشبیہات و استعارات ، ظرافت اور پہلودار اشعار - پہلودار اشعار کی انھوں نے مثالیں بھی دی ہیں - بجنوری نے بھی اس خصوصیت کی بڑی تعریف کی ہے - وہ لکھتے ہیں کہ " جس طرح سفید رنگ میں تمام آفتابی الوان مضمر ہیں ، ان کے بعض اشعار کی سادگی میں عجیب و غریب لطیف معنی پنہاں ہیں " - لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب غالب کے جام جہاں‌نما ہونے کی وجہ سے ہے - خیال اکثر بلند اور لطیف ہوتا ہے اور الفاظ اس کا صرف ایک پہلو ہی ظاہر کرتے ہیں - دوسرے پہلوؤں کی طرف صرف ذہن ہی منتقل ہوسکتا ہے - ہاں غالب کی ایک اور خصوصیت ایسی ہے جو انھیں میر کے برابر لا کھڑا کرتی ہے ، وہ ان کی سادگی و پُرکاری ہے - میر کا عام رنگ یہی ہے اور اس کی وجہ سے ان کی چھوٹی بحروں میں اشعار نشتر بن کر دل میں کھٹکتے ہیں - غالب کے آخری دور میں بہت سی غزلیں ایسی ہی ہیں - چند مثالیں میر و غالب کی اس مشترک خصوصیت کی ملاحظہ ہوں جنھیں دیکھ کر بجنوری کو ابن رشیق کا مشہور قول یاد آگیا تھا -

میر :— قدر رکھتی نہ تھی متاع دل سارے عالم کو میں دکھا لایا

سب پہ جس بار نے گرانی کی اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

وصل و ہجراں کے جو دو منزل ہیں راہ عشق میں دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلۂ پر پیچ و تاب شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

غالب کی غزلوں کے مطلع ملاحظہ ہوں :—

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی میری وحشت تری شہرت ہی سہی

کوئی دن گر زندگانی اور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

غرض دیوان غالب کے مطالعہ سے ایک زبردست شخصیت، اس کے تصورات، اس کی ذہنیت، اس کا رد عمل سب سامنے آجاتے ہیں۔ مگر تعجب ہوتا ہے کہ ان کے زمانے میں ان کی اتنی قدر کیوں نہ ہوئی۔ غالب نے اپنی ناقدری کا رونا بہت کچھ رویا ہے اور اس کا انھیں اتنا ہی صدمہ تھا جتنا مالی پریشانیوں یا پنشن نہ ملنے کا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ "میں خدا کا شکر کرتا ہوں اور خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا کہ ان باون برسوں میں اس نے کس قدر معنیٰ کے دروازے مجھ پر کھولے ہیں اور میری فکر کو کس درجہ بلندی بخشی ہے۔ افسوس کہ لوگوں نے میرے کلام کی خوبی کو نہ سمجھا"۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ میرے دعویٰ پر یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں۔ انھیں اگر کوئی قدردان مل جاتا تھا تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ ان کے زمانے میں ان کی ویسی ہی قدر ہوئی جیسی شیکسپیر کی اس کے زمانے میں ہوئی۔ یہ حشر ان تمام اشخاص کا ہوتا ہے جو اپنے زمانے سے بہت آگے ہوتے ہیں۔ غالب کے دور کی جو روح تھی وہ عام طور پر وہی تھی جس سے وہ بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس میں یا تو شاہ نصیر کی سنگلاخ زمینیں تھیں یا ذوق و ظفر کی سادہ محاورہ بندی یا پھر مومن کی معاملہ بندی اور ناہمواری۔ اس کے لیے غالب کی فطانت کو سمجھنا آسان کام نہ تھا۔ تاہم غالب کے معاصرین نے غالب کی قدر اپنی بساط کے موافق کی۔ شیفتہ کی رائے غالب کے متعلق دیکھنے کے قابل ہے۔ خود ظفر نے جو ذوق کے مقلّد تھے ان کی قدر و منزلت کی اور استاد کے مرنے کے بعد انھیں اپنا استاد مقرر کیا۔ اپنے زمانے میں بھی وہ ایک غیر معمولی شاعر سمجھے جاتے تھے۔ مگر اس سے زیادہ ان کے دور سے امید رکھنی فضول ہے۔ ان کی پوری قدر "یادگار غالب" کے بعد شروع ہوئی۔

غالب کا رنگ ایک کامیاب رنگ ہے۔ اس کی تقلید ان کے زمانے میں کسی نے نہ کی بلکہ ان کے مرنے کے بعد رامپور اور دهلی اور لکھنؤ کے دبستانوں میں اور

ہی رنگ رہا، مگر 'یادگار' کی اشاعت کے بعد سے غالب کا رنگ مقبول ہونا شروع ہوا۔ اقبال اردو کے تمام شعرا سے زیادہ غالب کے ممنون ہیں ۔ دونوں میں وہی لفظی صنعت گری، رفعت تخیل، بلاغت، فلسفہ دانی، رواجی مذہب کے معاملہ میں آزاد خیالی ملتی ہے ۔ اقبال اپنے ابتدائی دور میں سب سے زیادہ غالب سے متاثر ہوئے ہیں ۔ فانی غالب کے شاگرد ہیں اور غالب کی غزلوں پر بہت سی غزلیں انھوں نے لکھی ہیں ۔ انھوں نے غالب کی طرح سوچنا چاہا ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں ۔ مگر ان کے یہاں غالب کی روح نہیں، اس سے اقبال زیادہ مستفید ہوئے ہیں ۔ اصغر میں مومن و غالب دونوں کے رنگ کی جھلک ملتی ہے ۔ ان کی عارفانہ نگاہ اکثر غالب کے رموز کو برافگندہ نقاب دیکھتی ہے اور انھیں موضوعات پر اظہار خیال کرتی ہے ۔ اصغر کی بعض شگفتہ ترکیبیں غالب کی مرہون منت ہیں ۔ 'یادگار' نے غالب کو ملک سے روشناس کرایا ۔ اس کے بعد بجنوری نے غالب کے محاسن کو اجاگر کیا اور اپنے پر زور قلم سے غالب کی خامیوں کو بھی خوبی ثابت کیا ۔ ان کی تنقید میں وہی رنگ ہے جو کولرج کی شیکسپیر پر تنقیدات میں ہے ۔ دونوں کی تحسین تخلیق کی حد تک پہنچ جاتی ہے ۔ دونوں اپنے ہیرو کی روح تک پہنچ گئے ہیں اور اکثر اس کے ساتھ پرواز کرتے ہیں مگر دونوں عقیدت کے جوش میں قوت فیصلہ کو پس پشت ڈال دیتے ہیں ۔ بجنوری کی تنقید نے غالب کو تمام ملک سے روشناس کرایا ۔ ان کے دیوان کی شرحیں شایع ہونے لگیں ۔ نفیس ایڈیشن نکلے اور غالب کی وہ مشہور پیشین گوئی پوری ہوئی :

کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است   شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواھد شدن

اسی مقبولیت نے بڑھتے بڑھتے لکھنوی شعرا کے دلوں میں اثر کیا ۔ جہاں غالب کے خیال کو میر کی زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی ۔ عزیز، ثاقب، صفی ان سب کے یہاں غالب کا اثر پایا جاتا ہے ۔ ان سب میں عزیز اس لحاظ سے سب سے زیادہ کامیاب ہیں ۔

غرض کہ غالب کی مقبولیت ایک طرف تو ان کے رنگ کی تقلید میں ظاہر

ہوئی اور دوسری طرف ان کے حالات، ان کے کلام اور سوانح سے دلچسپی میں۔ یہ دونوں چیزیں اس وقت اپنے شباب پر ہیں۔ چنانچہ حال میں مہر، اکرام اور عرشی تینوں کی جو کتابیں شایع ہوئی ہیں وہ اسی مقبولیت کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کے حالات، نقطۂ نظر، رد عمل وغیرہ سے دلچسپی کی وجہ سے ان کے خطوط اور فارسی کلام کو بھی دلچسپی سے دیکھا جاتا ہے۔ ان میں سے اردو خطوط کی خود بھی الگ اہمیت ہے اور لطیف جیسا ناقد بھی انھیں اس بنا پر اردو نثر کے خانہ سازوں میں شمار کرتا ہے۔ مگر ان کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھی ان کی چھان بین کی گئی۔

ان کی اس مقبولیت کے مختلف اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ بجنوری ان کے تنوع کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ کونسا نغمہ ہے جو ان کے تاروں میں خوابیدہ یا بیدار نہیں۔ اکرام نے ان کی اصلیت پر زور دیا ہے۔ حالی ان کی ظرافت کے زیادہ قائل معلوم ہوتے ہیں۔ فلسفی کو غالب کے یہاں کانٹ، ہیگل اور برگساں کی تعلیمات کا عکس ملتا ہے۔ صوفی ان میں خدا کا جلوہ دیکھتا ہے۔ مشکل پسند طبائع ان کی دقیق اور پیچیدہ ترکیبوں پر سر دھنتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ خود غالب سے متعلق نہیں، غالب کے دانا دوست شیفتہ، فضل الحق اور مرزا خانی کی وجہ سے ہے۔ یہ وہ حضرات تھے جنھوں نے مرزا کے کلام کے انتخاب کی ضرورت محسوس کی اور مرزا کو انتخاب پر راضی کیا۔ نسخۂ حمیدیہ اب چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ غیر مطبوعہ دیوان غالب کے اور اجزا بھی سامنے آگئے ہیں، ان میں بعض بہت اچھے اشعار موجود ہیں، مگر بہ حیثیت مجموعی غالب کا منتخب کلام ان کے طرز کی تمام خصوصیات کا حامل ہے۔ لوح سے تمت تک سو صفحے ہیں مگر ان میں کیا نہیں۔ حالی کی نظر بھی شاید اسی طرف گئی تھی، 'یادگار' میں لکھتے ہیں کہ "مرزا کی موجودہ غزلیات گو بہ مقابلہ بعض شعرا کے تعداد میں کیسی ہی قلیل کیوں نہ ہوں لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے انتخابی اشعار سے کم نہیں، اور جس قدر بلند اور عالی خیالات مرزا کے ریختہ میں نکلیں گے اس قدر کسی ریختہ گو کے کلام میں نکلنے کی امید نہیں ہے۔

چنانچہ مرزا کی مقبولیت کے اسباب میں سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ان کے کلام کا ان کی زندگی میں اور ان کے ایما سے انتخاب ہوگیا تھا، "یادگار" نے انھیں عوام سے روشناس کرایا، بجنوری نے ان کی شہرت کو چار چاند لگائے، چنانچہ بعد کے ناقدین اور تذکرہ نویس انھیں حضرات کے خوشہ چیں ہیں۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ غالب کا مستقبل کیا ہے؟ اس کا جواب دینا آسان نہیں اس لیے کہ اس میں کلام غالب کی اچھائی اور برائی کے علاوہ دوسرے عناصر کا بھی لحاظ کرنا ہے۔ مثلاً فارسی زبان سے اجنبیت روز بہ روز بڑھتی جاتی ہے اور غالب کے اشعار کا پورا پورا مزا بغیر فارسی سے واقفیت کے حاصل نہیں ہوتا۔ دوسرے قیاس یہ چاہتا ہے کہ آنے والی نسلیں ادب میں محض جمالیاتی نقطۂ نظر نہ دیکھیں گی بلکہ اپنے درد کا علاج بھی اس سے چاہیں گی، ان حالات کی روشنی میں غالب کو بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا اور ممکن ہے کہ غالب بھی ایک کلاسیک کی حیثیت اختیار کرکے الماری کے سب سے اونچے تختہ پر جگہ پائے مگر اس کے پڑھنے اور اس سے کیف حاصل کرنے کی نوبت نہ آئے۔ غالب کے نقادوں نے اس اجنبیت کو بہت کچھ دور کرنے کی کوشش کی ہے، تاہم ہمارا خیال یہ ہے کہ شاعر غالب کے پاس اس حالت کے لیے کوئی علاج نہیں ہے ہاں غالب کے خطوط کی اہمیت شاید پہلے سے بھی زیادہ ہو۔ ایک زمانہ وہ تھا جب غالب کی شاعری کی مقبولیت اور شہرت کی وجہ سے ان کے خطوط بھی مقبول تھے، زمانہ اپنا مذاق جلد جلد بدل دیتا ہے۔ ناممکن نہیں ہے اگر غالب کے خطوط آیندہ اور بھی مقبول ہوں اور ان کی مقبولیت کی وجہ سے ان کا کلام بھی بے اعتنائی سے بچ جائے۔ یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ اردو ادب میں ایک ایسا جامع صفات و حیثیات شخص موجود ہے جس کی کوئی نہ کوئی چیز کسی نہ کسی وجہ سے اردو ادب میں ہمیشہ مقبول رہے گی اور جس کے آئینہ میں آنے والی نسلیں کوئی نہ کوئی بات اپنی دل چسپی اور دل بستگی کی پا سکیں گی۔ حالی کا قول ہے کہ "لٹریری قابلیت کے لحاظ سے مرزا جیسا جامع صفات آدمی امیر خسرو اور فیضی کے بعد آج تک ہندستان کی خاک سے نہیں اٹھا"۔

مگر قیاس یہ ہے کہ فیضی اور خسرو دونوں سے زیادہ غالب کی شہرت باقی رہےگی۔ اور ان کی شخصیت، ان کی شاعری، ان کے خطوط، ان کی نثر، ان کی سیرت و عادات، ان سب کے گن گائے جاتے رہیں گے۔ غالبِ ذوق سے ناحق ناراض تھے۔ وہ بیچارہ تو بہت تھوڑی عمر میں مرگیا۔ شباب کے بدلے اسے موت ہی آئی، اس کا رنگ داغ سے آگے نہ بڑھا۔ غالب کی حیات تو حیات جاوداں ہے۔ وہ اس برادری میں شامل ہیں جن کی عمر پر موت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی ساری زندگی میں ایک ترقی پذیری ملتی ہے وہی ترقی پذیری جو ہمیں اقبال کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ ان کے ابتدائی کلام اور ان کے آخر زمانے کے کلام میں صاف فرق ہے۔ یہ ترقی پذیری ہر شاعر کے یہاں نہیں ہوتی۔ بہت سے مرنے سے پہلے مرجاتے ہیں۔ غالب بوڑھے ہوتے جاتے تھے مگر ان کا کمال جوان ہو رہا تھا۔ اس جوانی کی بہار سے ہم اب تک مستفید ہورہے ہیں۔

پنڈت پدم سنگھ شرما مرحوم
ساہتہ آچاریہ (استاد ادب)

(از اقبال ورما صاحب سحر ہنگامی)

اردو و ہندی کی جا و بےجا حمایت کرنے والے لوگ خواہ اپنی تحریر کو عربی و فارسی یا سنسکرت کی غیر ضروری ملاوٹ سے کتنا ہی بوجھل اور کٹھن بنا دینا پسند کریں اور اس کے لیے وہ خواہ علمی و ادبی زبان کو عوام کی بول چال سے کتنا ہی مختلف اور جداگانہ بتلائیں، پھر بھی ہر مصنف کی بالکل قدرتی طور پر یہ دلی خواہش ہوا کرتی ہے کہ اس کی ہر بات کو زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھ اور سمجھ سکیں جس سے جہاں ایک طرف پڑھنے والوں کے خیالات و احساسات میں ترقی ہو وہاں دوسری طرف لکھنے والے کی عزت و شہرت میں بھی معقول اضافہ کی امید ہوسکے ۔ اس خواہش کا ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی کو کبھی انکار نہیں ہوسکتا اور ایسی خواہش کی بہ دولت آج وہ تحریک کچھ نہ کچھ زور پکڑ رہی ہے جو اردو اور ہندی کو جتنا بھی ممکن ہو روز مرہ کے درجے پر لاکر ان دونوں زبانوں کو صرف ایک ہندستانی زبان کا روپ دینا چاہتی ہے ۔ اس کوشش کا نتیجہ کیا ہوگا، یہ بتلا دینا ابھی وقت سے پہلے کی بات ہوگی، مگر اس میں شبہہ نہیں کہ جس حد تک بھی کامیابی ہو سکےگی یا کامیابی کے ارادے میں وسعت و مضبوطی آسکےگی اسی حد تک نہ صرف ہندو مسلم اتحاد کے نازک مسئلہ کا بہت کچھ حل ہو سکےگا بلکہ اس سے بھی زیادہ مفید نتیجہ یہ نکلےگا کہ قوم کو بہ‌حیثیت مجموعی ان مدارج کے طے کرنے میں آسانی ہوگی جو اس کی معلومات میں بلندی لاسکیں‌گے اور اس طرح سمجھ میں ترقی ہونے کے ساتھ ہی اس کی علمی

قابلیت و لیاقت کی سطح برابر اونچی ہوتی اور اوپر اٹھتی ہوئی چلی جائےگی - پھر یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ عوام کی اس واقفیت کی بہ دولت نہ صرف ایک عام ترقی کا نظارہ ہر سمت دکھائی دےگا بلکہ یکسانیت و یک‌جہتی کی وہ خوشگوار فضا پیدا ہوگی جو اعلی اور ادنیٰ کے فرق کو ایک حد تک مٹاتی ہوئی قوم کی اس بھاگ دوڑ میں کچھ نہ کچھ رکاوٹ ضرور ڈال دےگی جو آج اس کو باہمی ناچاقیوں کی طرف سرپٹ لیے جارہی ہے -

یہ ساری باتیں ایسی اہم ہیں جو کسی طرح نظرانداز نہیں کی جاسکتیں - شکر ہے کہ آج ایسا ہو بھی نہیں رہا - یہ ٹھیک ہے کہ نہ سردست ہندو اپنی ہندی کو ہندستانی پر قربان کرنے کو تیار ہیں اور نہ مسلمان اپنی اردو کو - نام کی مخالفت زبان سے کم نہیں ہے، بالخصوص ہندؤں کو یہ اعتراض ہے کہ جب ہندی نام خود مسلمانوں کا دیا ہوا ہے تو اب ہندی کو ہندستانی کیوں کہا جائے؟ بات سچ ہے، لیکن سوچنا یہ ہے کہ جن مسلمانوں نے ملکی زبان کو ہندی نام دے کر اسی کی مدد سے اردو زبان تیار کی وہی اب اگر اس کو اردو الفاظ کے بڑھے ہوئے چلن کے اعتبار یا کسی اور خیال سے ہندستانی کہنا پسند کریں تو حرج ہی کیا ہے؟ آخر ہمارے ملک کا نام ہند بھی ہے اور ہندستان بھی، پھر ہماری ملکی زبان بالکل یکساں طور پر ہندی بھی کہی جاسکتی ہے اور ہندستانی بھی - مگر یہ نام و زبان کے جھگڑے کل کے کل انھیں تک محدود ہیں جو اہل زبان ہیں یا ویسا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں - عوام سے تو کسی پوچھ کچھ کی ذرا بھی ضرورت نہیں اور نہ یہ دیکھنا ہے کہ وہ کیا بولتے اور کیا چاہتے ہیں اور کس میں ان کا بھلا ہے - ان سے تو کسی قسم کے لگاؤ کا خیال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب انھیں دین و ایمان کے نام پر اکسا کر اپنا کوئی نجی مطلب پورا کرنا ہوتا ہے اور اس طرح اپنے کو دھوکا دیتے ہوئے انھیں بھی دھوکے میں ڈال دیا جاتا ہے - بہرحال اسی بھلاوے میں پڑ کر آج اس زبان کی مخالفت کی جارہی ہے جو ہماری کتنی ہی بڑی بڑی گتھیوں کو سلجھانے کی صلاحیت رکھتی ہے - مگر اس امر سے کسی قدر تسکین ہوتی ہے کہ اس مخالفت کے باوجود آج بھی زبان کے کتنے ہی

ہندو مسلمان سدھارک لارڈ مارلے کے اس قول کے مطابق کہ "کامیابی کی تاریخ ان لوگوں کی تاریخ ہے جو کم تعداد والے ہیں" اپنی 'رام دُھن' میں مست ہو کر اپنا راگ برابر آلاپے جا رہے ہیں۔ ایسے ہی مستوں یا سدھارکوں میں ہمارے شرماجی بھی تھے جن کی پاک و مبارک یادگار میں یہ مضمون لکھا جا رہا ہے۔

شرماجی نقاد تھے، اڈیٹر تھے اور مضمون نگار بھی۔ ان کی شہرت کی شروعات پہلی بات سے ہوئی، پھر دوسری نے اسے کچھ دور آگے بڑھایا۔ مگر میرے خیال سے مرحوم میں جو سب سے بڑا وصف تھا وہ ان کی زبان کی بے حد چستی، سادگی اور صفائی تھی اور اسی ایک خاص وصف کی بدولت ان کا نام اردو اور ہندی کی ادبی دنیا میں عرصہ تک قائم رہےگا۔ وہ لکھتے ہندی تھے مگر ان کی تحریر میں اردو کے الفاظ اور اشعار اس کثرت سے ہوتے تھے کہ واقعی روزمرہ کا آئینہ سا سامنے آجاتا تھا جس میں ہندستانی طرز تحریر کا عکس نظر آتا تھا۔ انھیں اپنی سیکھی ہوئی زبانوں پر پورا قابو تھا پس ان کی عبارت میں کوئی لفظ بےموقع یا بےربط نہ معلوم ہوتا تھا۔ یہی حال ان کی تقریر کا بھی تھا۔ ہندی کے ساتھ اردو برابر ملی جلی ہوتی تھی۔ مشکل ہندی کا مضحکہ اڑاتے تھے اور اردو کو ہندی ہی کا ایک بدلا ہوا روپ مانتے تھے۔ اس بات پر بھی زور دیتے تھے کہ ایک کامیاب ہندی نویس بننے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ لکھنے والا اردو زبان سے بھی واقف ہو، خواہ وہ نظم لکھتا ہو یا نثر۔ اگر لارڈ مارلے کی یہ بات سچ مان لی جائے کہ "کوئی شخص اپنی عام قابلیت کے تناسب سے شہرت نہیں پاتا بلکہ اس لیے کہ وہ کوئی ایسا کام کرتا یا ایسی بات کہتا ہے جس کا کرنا یا کہنا وقتی لحاظ سے ضروری تھا" تو مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ مرحوم اس عزت و ناموری کے پورے حقدار تھے جو انھوں نے ایک وقتی زبان کی تحریک و اشاعت کے سلسلے میں حاصل کی۔

اگرچہ جب ۱۹۲۸ء میں مظفرپور میں آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن کا اجلاس ہوا تھا تو پنڈت جی نے اپنی صدارتی تقریر میں یہ فرمایا تھا کہ:- "ہندو مسلمانوں کو ہندی اور اردو کے لیے لڑتا دیکھ کر دھلی کی ایکتا پرشد (اتحادی انجمن) میں

لیڈروں نے یہ فتویٰ دیا ہے۔۔۔کہ نہ ہندی کہو نہ اردو، دونوں کا ایک نام ہو ہندستانی۔ اچھی بات ہے، پر اس سے کیا یہ جھگڑا مٹ جائےگا؟ پنچوں کا کہنا سر ماتھے پر، مگر پرنالہ تو وہیں بہےگا۔ بھولے بھالے ہندو بھائی بھلے ہی مان جائیں پر کیا مسلمان بھائی اسے قبول کریں گے؟ جب وہ صدیوں سے چلتے ہوئے اس ہندی نام کی مخالفت کرتے ہیں جسے میر تقی، انشا اور آزاد جیسے ودوانوں نے ٹھیک سمجھ کر استعمال کیا ہے، پھر وہ اردو کی جگہ ہندستانی کو کیسے دیں گے؟ آخر ہندی نام بھی تو ہندوؤں کا رکھا ہوا نہیں ہے۔ بھارت کی قومی زبان کا یہ نام تو مسلمانوں نے ہی رکھا تھا ۔۔۔۔ہندستانی نام تو ہمارے حاکموں کے دماغ کی اپج ہے۔۔۔۔اگر یہ نیا نام دو جاتیوں کی ایکتا کا سادھن (ذریعہ) ہوتا تو وہ اسے پسند کرکے اپنی طرف سے کیوں پیش کرتے؟ ۔۔۔۔ سچ ہے:

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں جس کے سر پر جو چاہیں تہمت دھر دیں
بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبر تم کیا ہو خدا کے تین ٹکڑے کر دیں
(اکبر الٰہ آبادی)

۔۔۔۔گورنمنٹ نے اپنی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کا پتہ اسی طرح کئی بار دیا ہے۔۔۔۔ہندستانی نام سے ہندی اردو کا فرق دور نہ ہوگا بلکہ ایک تیسری زبان اور پیدا ہوجائےگی جسے سرکاری بولی کہنا درست ہوگا۔ اسٹینڈرڈ ٹایم کی طرح گورنمنٹ اسٹینڈرڈ بھاشا بھی چلانا چاہتی ہے۔۔۔۔اگر یہ چال چل گئی تو ہندی اردو ادب کا بالکل خاتمہ ہوجائےگا۔ اردو ہندی دونوں بحق سرکار ضبط ہو جائیں گی۔۔۔۔۔۔"[۱]

پھر بھی اس واقعہ کے تقریباً چار ہی سال بعد انھوں نے ہندستانی اکیڈمی یوپی (الٰہ آباد) کی فرمائش پر "ہندی، اردو اور ہندستانی" نام کی ہندی کتاب لکھی جو ۵، ٦، ۷ مارچ ۱۹۳۲ء کو اکیڈمی مذکور کے سالانہ جلسہ میں تقریر کے طور پر پڑھی گئی تھی اور جس کے لیے انھیں اکیڈمی کی جانب سے ایک ہزار روپیہ بھی

---

۱ یہ اقتباسات قریب قریب جوں کے توں نقل ہوئے ہیں، کہیں کہیں برائے نام ہی ہندی الفاظ اردو میں بدل دیے گئے ہیں۔ — مشعر

دیا گیا تھا ۔ کتاب بڑی عجلت میں مگر بڑی تحقیق سے لکھی گئی تھی جو ایک مہینہ کی دن رات کی محنت کے بعد پڑھے جانے کے ایک روز قبل ہی ۴ مارچ ۳۲ ع کو ختم ہوئی تھی ۔ کتاب کس پایہ کی ہے ' اس کے متعلق یہی کہنا کافی ہے کہ سر عبدالقادر جیسے مستند ادیب نے اس کی بڑی تعریف کی تھی ۔ یہ کتاب مرحوم کی آخری تصنیف ہے جو ہندستانی زبان کی حمایت میں بہت سادہ اور دل‌کش طریقہ پر لکھی گئی ہے ۔ اس کے آخری حصہ میں یہ تحریر ملتی ہے :— " شروع میں ہندی اردو دونوں ایک ہی تھیں ۔ بعد کو جب ویاکرن (قواعد)، پنگل (عروض)، رسم‌الخط اور طرز تحریر کے فرق وغیرہ کے سبب دو مختلف اطراف میں پڑ کر یہ ایک دوسرے سے بالکل الگ ہونے لگیں تو عوام کے سمجھنے اور شکشا کے وچار سے ان کا بھید مٹا کر انھیں ایک کرنے کے لیے بھاشا کی ان دونوں شاخوں کا متحدہ نام ہندستانی رکھا گیا.........

ہندی والے اردو ادب سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں ' اسی طرح اردو والے ہندی کے خزانے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔ اگر دونو فریق ایک دوسرے کے قریب پہنچ جائیں تو وہ غلط فہمیاں اپنے آپ ہی دور ہوجائیں جو ایک سے دوسرے کو دور کیے ہوئے ہیں ۔ ایسا ہونا کوئی مشکل بات نہیں ' صرف مضبوط ارادے اور ہمت کی ضرورت ہے " ۱

مرحوم کی اوپر والی دونوں تحریریں ظاہراً ایک دوسرے کی ضد ہیں ۔ وہ اس وقت زندہ نہیں کہ اس اختلاف کی کوئی معقول وجہ دریافت کی جاتی ۔ مگر قیاساً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان کو ہندستانی کے نام سے چڑ تھی ' شاید اسی لیے کہ یہ نام ایک انگریز (ڈاکٹر جان گلکرائسٹ) کے دماغ سے نکلا تھا ۔ مگر انھیں جلد ہی اس غلطی کا احساس ہوگیا جو ان کی آخری تصنیف میں دور کردی گئی ۔ وہ بہ‌خوبی سمجھ گئے تھے کہ اردو ہندی کا یہ نام نیا انھیں پسند ہو یا نہ ہو ' پھر بھی وہ اپنی تحریر و تقریر میں اسی کے پیرو تھے اور اسی طرح وہ اپنے علمی پیام کو زیادہ

---

۱ یہ اقتباسات قریب قریب جوں کے توں نقل ہوئے ہیں ۔ کہیں کہیں برائے نام ہی ہندی الفاظ اردو میں بدل دیے گئے ہیں ۔ سحر

سے زیادہ ہندستانیوں کے کانوں میں ڈال کر ان کے دل نشیں کرا سکتے تھے ۔ ایسی حالت میں کسی کام کو کرتے ہوئے اسی کے نام سے چڑنا کسی طرح مناسب نہ تھا ۔ کام کی مشق و مہارت بہت پرانی ہوچکی تھی اور نام کا نیا پن اس میں کوئی خلل نہ ڈال سکتا تھا ۔ پھر کام کے ساتھ نام کو مان لینے کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا؟

مرحوم نے اپنی اسی کتاب میں جہاں ہندی اردو کی ابتدا میں ایک ہی ہونا کہا ہے وہاں ان کے بڑھتے ہوئے موجودہ فرق کو مٹا کر انھیں پھر ایک کرنے کی تدبیر بھی بتائی ہے ۔ لکھتے ہیں :- « لفظوں کے استعمال میں جب تک بیچ کے راستہ کا سہارا نہ لیا جائےگا ، میانہ روی اور اعتدال کی راہ پر نہ چلا جائےگا ، تب تک ہندی اردو کا بھیانک ریت پر بڑھتا ہوا یہ بھید کبھی دور نہ ہوگا ۔ الفاظ کا مناسب و موزوں استعمال ہی بھاشا کی کسوٹی ہے ۔ اس بارہ میں ڈاکٹر گریرسن صاحب ، مہامہوپادھیایے پنڈت گردھر شرما چترویدی ، شمس العلما مولانا حالی ، مولانا سلیم اور مولانا عبدالحق صاحب نے ہندی اردو والوں کو جو ٹھیک مشورہ دیا ہے وہ بہت ہی واجب اور وزنی ہے » † کہنا نہ ہوگا کہ یہ ان علم و ادب کے بزرگوں کے اسمائے گرامی

---

† مضمون ہذا کی تکمیل اور شرماجی کے مطلب کی تشریح کے لیے جن بڑے بڑے ادبی ماہروں کا حوالہ دیا گیا ہے ان کی رایوں کا درج کردینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو مختصراً یوں ہیں :—

ڈاکٹر گریرسن :— «میں زور کے ساتھ یہ صلاح دیتا ہوں کہ ہندی لکھنے والے جہاں تک ممکن ہو ٹھیٹھ لفظوں کا استعمال کریں ۔ ادھار لیے ہوئے سنسکرت لفظوں کا جتنا ہی کم استعمال ہو اچھا ہے ....میں ہر شخص کو جو ہندی کی ترقی چاہتا ہے یہ صلاح بھی دوں گا کہ وہ پراکرت کا مطالعہ کرے ، کیونکہ وہ ہندی کی ماں ہے ۔ اگر آپ ماں کو جانتے ہیں تو بیٹی کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں....»

مہامہوپادھیائے پنڈت گردھر شرما چترویدی پرنسپل مہاراجہ کالج جےپور :— ضرورتاً ہندی بھاشا میں سنسکرت لفظوں کا لینا مفید و کارآمد ہے مگر ہندی کو بالکل سنسکرت ہی بنا دینا اچھا نہیں ۔ زیادتی ہر جگہ منع ہے....لکھنے والوں کو سدا درمیانی راستہ پکڑنا چاہیے ۔ دوسرے صوبوں میں ہندی پرچار کا جیسے دھیان رکھنا ہے سب درجے کے لوگوں کو ایک بھاشا سمجھانے کا بھی اس سے کم دھیان نہیں رکھنا ہے ۔ اس لیے بھاشا ایسی ہونی چاہیے جسے عوام بھی سمجھ سکیں ۔ عام بول چال کی بھاشا سے چاہے قدرتاً اس میں فرق ہو مگر عام لوگوں کے سمجھنے کے قابل تو رہے....»

بقیہ حاشیہ پر صفحہ ۲۶۳ :

ھیں جن کی قیمتی باتوں کو ماننے اور ان پر چلتے ہوئے اردو اور ہندی کا فرق بہت کچھ مٹایا جاسکتا اور دونوں کو ہندستانی نامی ایک زبان کے سانچے میں ڈھالا جاسکتا ھے۔

اس فرق کو مٹانے کے متعلق مرحوم نے اپنی اسی آخری کتاب میں ایک جگہ یہ بھی لکھا ھے :- " ہندی اردو کو دو جداگانہ حصوں میں منقسم کردینے کا خاص سبب رسم الخط کا فرق ھے۔۔۔۔یہ بھید ہونوں زبانوں اور قوموں میں ایکتا نہیں ہونے دیتا۔ اگر یہ بھید کا بکھیڑا آڑے نہ آتا تو بھاشا میں اور اس کے سبب ہندو مسلمان جاتیوں میں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۳

شمس العلما مولانا حالی (مقدمہ میں) :- "اردو پر قدرت حاصل کرنے کے لیے صرف دلی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں ھے بلکہ یہ بھی ضرور ھے کہ عربی و فارسی میں کم سے کم متوسط درجے کی لیاقت اور ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جئے۔ اردو زبان کی بنیاد۔۔۔۔ہندی بھاشا پر رکھی گئی ھے۔ اس کے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصہ اسما کا ہندی سے ماخوذ ھے اور اردو شاعری کی بنیاد فارسی شاعری پر جو عربی شاعری سے مستفید ھے، قائم ہوئی ھے۔ نیز اردو زبان میں بہت بڑا حصہ اسما کا عربی و فارسی سے ماخوذ ھے۔ پس اردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا کو مطلق نہیں جانتا اور محض عربی و فارسی کے نان گاڑی چلاتا ھے یہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزل مقصود تک پہنچانی چاھتا ھے اور جو عربی و فارسی سے نابلد ھے اور ہندی بھاشا یا محض مادری زبان کے بھروسہ پر اس بوجھ کا متحمل ہوتا ھے وہ ایک ایسی گاڑی ڈھیلتا ھے جس میں بیل نہیں جوتے گئے۔۔۔۔اردو زبان بہ نسبت اور زبانوں کے سنسکرت اور بھاشا کے خیالات سے زیادہ مناسبت رکھتی ھے، اس لیے ان زبانوں سے بھی خیالات اخذ کرنے میں کمی نہ کریں۔۔۔۔"

مولانا وحیدالدین سلیم (وضع اصطلاحات میں) :- مگر افسوس ھے کہ ہمارے زمانہ کے بعض غزل گو شاعر۔۔۔مستعمل اور مروج زبان میں سے چھیل چھیل کر بہت سے الفاظ تو نکالتے اور متروکات کا دایرہ وسیع کرتے جاتے ھیں لیکن ایسا کوئی سامان مہیا نہیں کرتے۔۔۔۔جس سے ہماری زبان میں ادائے مطالب و خیالات کی وسعت پیدا ہو اور اس کو دن دونی اور رات چوگنی ترقی نصیب ہو۔ اگر کوئی شخص بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر کسی فارسی یا عربی لفظ کو کسی ہندی لفظ کے ساتھ جوڑ دیتا ھے یا فارسی زبان کے کسی سابقے یا لاحقے کو کسی ہندی لفظ کے ساتھ ملا دیتا ھے یا کسی ہندی سابقے یا لاحقے کو عربی یا فارسی لفظ کے شروع یا آخر میں لگادیتا ھے یا کوئی مصدر بناکر اس کے مشتقات سے کام لیتا ھے تو یہ نظم و انشا کے درمیان اس کا قلم پکڑ لیتے ھیں۔۔۔۔اور اس سے کسی گزشتہ شاعر کی سند کا مطالبہ کرتے ھیں اور فرماتے ھیں کہ جو الفاظ پہلے بن چکے ھیں وہ سماعی ھیں ان پر قیاس

بقیہ حاشیہ پر صفحہ ۲۷۳

اتنا بڑا اور بھیانک بگاڑ کبھی نہ پیدا ہوتا۔ ہندی اردو ایک نہیں، ایک ہی رہتیں"۔
ہمارے لیے کون سا رسم الخط مناسب ہوگا اس کے لیے کتاب مذکور میں آگے کچھ رائیں
درج ہیں۔ ملاحظہ ہوں :-

(۱) " واحد رسم الخط کی اشاعتی انجمن کے ایک انگریز وائس پریسیڈنٹ (نائب صدر) نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ دیو ناگری حروف کا ساری دنیا میں پرچار ہونا چاہیے، کیونکہ اس کے مانند سراپا مکمل کوئی دوسرا رسم الخط نہیں "۔

(۲) " مُجھے (اڈیٹر اردو کو) اکثر اردو کی قدیم کتابوں کے مطالعہ کا اتفاق ہوتا ہے۔ پرانے الفاظ کے صحیح پڑھنے اور صحیح تلفظ کے دریافت کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ اگر لاطینی یا ناگری حروف میں یہ تحریریں ہوتیں تو اتنی دقت نہ ہوتی"۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۳

کرکے نئے الفاظ بنائے نہیں جاسکتے' حالانکہ وہ حضرت یہ خیال نہیں کرتے کہ جب کوئی ایسا ہی مخلوط لفظ.... یا نیا مصدر بنایا گیا تھا اور کسی شاعر نے اس کو اول اول استعمال کیا تھا تو ایسا ہی مطالبہ کرنے پر وہ اسی لفظ یا مصدر کی کوئی سند گزشتہ شعرا کے کلام سے پیش نہ کرسکتا تھا۔ اگر بالفرض وہ کوئی ایسا ہی دوسرا لفظ پیش کرتا جو بن کر مستعمل ہوچکا تھا تو اس سماعی لفظ کو قیاسی کیوں کر ثابت کرسکتا تھا؟۔ پھر یہ خیال نہیں کرتے کہ اگر انہیں جیسے زبان و الفاظ کے قابل اس زمانہ میں موجود ہوتے اور ان کا اختیار نافذ ہوتا تو کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہمارے بزرگ آج ہمارے لیے اردو زبان میں پچپن ہزار سے زیادہ الفاظ کا ذخیرہ چھوڑ جاتے....»

مولانا عبدالحق صاحب (مقدمہ انتخاب کلام میر) :— «.....اگرچہ میر اور ان کے ہمعصر شعرا کے کلام میں فارسیت غالب ہے لیکن اس زمانہ میں عربیت کا رنگ جو غالب ہوتا جاتا ہے وہ اس سے کچھ کم نہیں ہے- ان بزرگوں نے تو پھر بھی یہ کیا کہ جہاں کثرت سے فارسی الفاظ اور محاورے اور فارسی ترکیبیں داخل کیں وہاں بہت سے الفاظ کو اپنا کرلیا اور صرف صرف و نحو کی خراط پر چڑھا کر اردو بنالیا۔ لیکن آج کل یہ کوشش کی جاتی ہے کہ عربی الفاظ اور ترکیبوں کو جوں کا توں رکھا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ مقدس الفاظ اردو صرف و نحو کے چھو جانے سے نجس ہوجائیں- ان بزرگوں نے زبان کو بنانے اور وسیع کرنے کی کوشش کی اور بہت بڑا احسان کیا مگر آج کل لوگ ان کی تقلید کو ننگ سمجھتے اور ان کی کوششوں کو غلط العام سے تعبیر کرتے ہیں....ایک دوسرا فریق جو فارسی عربی کے مقبول الفاظ نکال کر ان کی جگہ غیر مانوس اور ثقیل سنسکرت کے الفاظ ٹھونسنا چاہتا ہے۔ اسی نامعقولی میں مبتلا ہے۔ ہماری رائے میں یہ دونوں زبان کے دشمن ہیں »۔

(«ہندی اردو اور ہندستانی» نامی کتاب سے)

اس میں شک نہیں کہ شرما جی ناگری یا ہندی رسم‌الخط کو بہترین سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ ہندؤں کی طرح مسلمان بھی ہندی لکھنا پڑھنا سیکھیں - ہندی ساھتیہ سمیلن کا چھٹا صوبائی اجلاس ۱۹۲۰ء میں مرادآباد میں ہوا تھا جہاں مرحوم نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے اپنی صدارتی تقریر میں یہ کہا تھا :- " ہندی کے تعلق ہمارے مسلمان بھائیوں کا کچھ نہیں بہت کچھ فرض ہے - ہندی کی اُنّتی (ترقی) میں مسلمان بھائیوں کا بہت ہاتھ رہا ہے - رسکھان ، رحیم ، رسلین وغیرہ بڑے بڑے شعرا پر ہندی ساھتیہ سدا ابھمان (فخر) کرتا رہے گا - ان کی ہندی رچنا کسی بھی ہندو کوی کی کوتا (شاعری) سے کم نہیں........جو بھاشا ہندو مسلمانوں کو کبھی ایک دل بناتی تھی ، جو ایکتا کا خاص ذریعہ ہے وہی ہمارے دُربھاگ سے آج ہندو مسلمانوں کے بِرودھ (عناد) کا ایک کارن بنا رہی ہے - مہاکوی (شاعر اعظم) اکبر نے کتنے پتے کی کہی ہے :-

وہ لطف اب ہندو و مسلماں میں کہاں اغیار ان پر گزرتے ہیں خندہ زناں
جھگڑا کبھی گائے کا ، زباں کی کبھی بحث ہے سخت مضر یہ نسخۂ گاؤ زباں

........بھاشا کے معاملہ میں........کٹرپن کا بھاؤ شوبھا نہیں دیتا - اورنگ زیب کا مذہبی تعصب مشہور ہے........مگر بھاشا کے سمبندھ میں (متعلق) وہ بھی فراخ دل تھے - ان کے دربار میں ہندی کوی رہتے تھے - اورنگ زیب خود بھی ہندی کے پریمی تھے - سنسکرت میں بھی کچھ دخل تھا - اس کے ثبوت میں ان کی ایک تحریر پیش کرتا ہوں........رقعات عالمگیری........میں ایک رقعہ (نمبر ۹) بادشاہ زادہ محمد اعظم شاہ بہادر کے نام ہے - ان شاہزادے نے کہیں سے خاص آموں کی ڈالی بادشاہ کے پاس بھیجی اور ان آموں کے نام رکھنے کے لیے........استدعا کی - جواب میں بادشاہ لکھتے ہیں :- «فرزند عالی‌جاہ - ڈالی انبہ مرسلۂ آن فرزند بذائقۂ پدر پیر خوش‌گوار آمد - برائے نام انبۂ گمنام استدعاء نمودہ اند - چون آن فرزند جودت طبع دارند رواداِر تکلیف پدر پیر چرا می‌شوند - بہر حال سدھارس† ، رسنابلاس‡ ، نامیدہ شد - » ڈالی لفظ فارسی کا نہیں ہے ، پھر بھی اورنگ زیب جیسے زبردست منشی نے اس کی جگہ عربی یا

† سدھا=امرت - ‡ زبان نواز (رسنا=زبان) -

فارسی لفظ گڑھ کر یا چن کر نہیں رکھا - جو بول چال میں تھا وہی رہنے دیا۔ آموں کے نام تو انھوں نے اس کمال کے رکھے ھیں کہ کیا کوئی رکھے گا........آم ھندستان کا میوہ ھے - فارسی یا ترکی نام اس کے لیے مناسب نہیں - یہی سمجھ کر بادشاہ نے یہ رسیلے نام تجویز کیے "۔

شرما جی کی پیدائش ایک بالکل معمولی سے گاؤں نائک نگلا (چاندپور) ضلع بجنور میں ۱۸۷۷ع میں ھوئی تھی - ان کی تعلیم کی ابتدا دس گیارہ سال کی عمر میں دیوبانی سنسکرت سے ھوئی تھی جس کا مزید مطالعہ انھوں نے بعد کو اورینٹل کالج لاھور اور پھر اپنے گرو پنڈت کاشی ناتھ جی کے پاس بنارس میں کیا تھا - درمیان میں ھندی، اردو اور فارسی بھی پڑھتے جاتے تھے اور ان زبانوں میں بھی انھوں نے رفتہ رفتہ خاصی لیاقت حاصل کرلی تھی† - برج بھاشا اور پراکرت کا بھی انھیں اچھا گیان تھا - مگر یہ سب کچھ زیادہ‌تر ان کے ذاتی مطالعہ کا نتیجہ تھا - سر والٹر اسکاٹ کا قول ھے کہ "ھرشخص کی تعلیم کا بہترین حصہ وہ ھوتا ھے جسے وہ خود سیکھتا ھے"۔ شرما جی پر یہ بات پوری طرح پوری اترتی تھی - پڑھنے کی انھیں دھن سی تھی جس میں کسی اور بات کا خیال تک نہ ھوتا - وہ اپنی سدھ بدھ تک بھول جاتے تھے - اس کے ثبوت میں خود شرما جی کی ایک تحریر کا خلاصہ قریب قریب بالکل ھی انھیں کے الفاظ میں دیا جاتا ھے جس سے یہ بھی ظاھر ھوگا کہ ان کے لکھنے کا ڈھنگ کتنا سادہ، کتنا مزیدار اور ساتھ ھی کتنا برجستہ، بےساختہ اور شاعرانہ ھوتا تھا - دیکھیے:-

"یہ جون سنہ ۱۱ع کے شروع کی بات ھے........اکبر کا دیوان پاکر دل دیوانہ خوشی سے مستانہ ھوکر ناچنے لگا........میں ان دنوں جوالاپور مہاودیالہ میں تھا - دن میں پڑھنے کی فرصت نہ ملتی - گرمی کا بڑا دن پہاڑ کی طرح ٹلتا نہ تھا........ جیوں تیوں کرکے........رات آئی چائے پی کر لیمپ جلایا - کتاب ھاتھ میں اٹھائی -

† کہتے تھے کہ انگریزی نہ جاننے کا مجھے پچھتاوا نہیں ھے - اس کے مطالعہ میں جو وقت لگتا وہ میں نے سنسکرت کے مطالعہ میں لگایا - چاھتا تو انگریزی خوب پڑھ سکتا تھا مگر سنسکرت چھوڑ کر اس میں وقت برباد کرنا گوارا نہ ھوا -

پڑھنے بیٹھا ھی تھا کہ آئے ھوئے دوستوں کی منڈلی نے آ گھیرا - اجی ! رھنے بھی دو ' اس گرمی میں پڑھنے بیٹھے ھو ' کتاب کہیں بھاگی جاتی ھے ' دن میں پڑھ لینا..... ایک صاحب اٹھے ' لیمپ اٹھاکر دور رکھ آئے - دوسرے کتاب چھیننے لگے - برسوں کے بھوکے کے آگے سے بھلے آدمیوں نے پرسا ھوا تھال اٹھا لیا...... میں من میں منانے لگا...... بھگوتی دیوی نیند ! کرپاکرو ' انھیں لے کر سوجاؤ ' میرا ادھار کرو ! پر انھیں نیند کہاں ؟ ایک بات ختم نہ ھوتی تھی کہ دوسری کا سلسلہ چھڑ جاتا تھا - رام رام کرکے دس بجے کے قریب نیند نے میری پکار سنی - وہ آئی اور ان کی آنکھوں میں چھاگئی - میں آھستہ سے اٹھا لیمپ لےکر اندر برامدے میں جابیٹھا - گرمی کچھ کم نہ تھی - پسینے پر پسینے آرھے تھے - پنکھا جھلوں کہ کتاب پڑھوں ؟ پتنگے کمبخت علیحدہ ناک میں دم کررھے تھے - مانو(گویا) سونے والوں نے اپنا چارج پتنگوں کو دےدیا تھا... جھنڈ کے جھنڈ پروانے چمنی کی دیوار پر سر دے دے مار رھے تھے ' لو سے لپٹنے کو جوجھ رھے تھے ' گویا زبان حال سے اکبر کے اس شعر کا مطلب سنا رھے تھے :

فانوس کو پروانوں نے دیکھا تو یہ بولے   کیوں ھم کو جلاتے ھو کہ جلنے نہیں دیتے

اور اس نہ جل سکنے کی جلن کو مجھ پر اتار رھے تھے ! نہیں ' سبق دے رھے تھے کہ سچی لگن ھے تو ھماری طرح اپٹ جاؤ کتاب سے - گرمی کا خیال نہ کرو ' ھماری طرف مت دیکھو ! آخر پڑھنے کی زبردست خواھش نے اس بکھن پر فتح پائی - میں محو ھوکر پڑھنے لگا - پڑھتے پڑھتے سمادھی (مراقبہ) سی ھوگئی - آنکھیں اور کتاب کے صفحے کھلے تھے ' باقی حواس کا بیوپار بند تھا - بڑے سائز کی ۲۸۲ صفحے سے اوپر کی کتاب ایک آسن سے لیٹے لیٹے پڑھ گیا - پڑھتا تھا اور مستی کا ایک نشہ سا چڑھتا جاتا تھا - پنسل ھاتھ میں تھی ' بڑھیا پدوں پر نشان کرتا جاتا تھا - ساری کتاب رنگ ڈالی - کھانڈ کی روٹی جدھر سے توڑی میٹھی نکلی - دل میں طرح طرح کے جذبات کا طوفان سا اٹھ رھا تھا.... غالب کا یہ مشہور شعر اس وقت اکبر کی شاعری پر صادق آرھا تھا :

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا   میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ھے

....پڑھتے پڑھتے رات بیت گئی، سورج نکل آیا، پر میں ہوش میں نہ آیا۔ اسی مستی کی دھن میں پڑھتا رہا....میں کتابوں کا کیڑا ہوں۔ جاڑے، گرمی اور برسات کی سیکڑوں راتیں محویت سے پڑھتے پڑھتے یونہی آنکھوں میں نکل گئی ہیں، پر اس رات کا سا....آنند دو چار بار ہی کبھی ملا ہوگا۔"†
اسی آنند کی غرض سے زیادہ سے زیادہ وقت تک جاگتے رہنے کے لیے انھوں نے چائے کا استعمال شروع کردیا تھا جو بڑھتے بڑھتے پانی کا پینا سا ہوگیا تھا۔ انھیں زیادتیوں اور بےاعتدالیوں کا اثر صحت پر پڑا جو بالاخر ان کی بےوقت وفات کا سبب بن کر رہا۔ بیماری میں دوا کرتے تھے مگر پرہیز سے تو بالکل پرہیز ہی تھا!

ان کا پڑھنا بھی کوئی چلتاؤ پڑھنا نہیں، بلکہ ایک ودیارتھی کا پڑھنا تھا۔ ہر کتاب کو بڑے غور سے پڑھتے اور شروع سے آخر تک پڑھتے، ساتھ ہی پنسل سے نشان لگاتے اور حاشیہ پر نوٹ بھی لکھتے جاتے تھے۔ کچھ خاص خاص باتیں علیحدہ نوٹ بک میں بھی درج کرلیتے جو سدا ان کے ساتھ رہتی تھی۔ ہر زبان کی کتابیں خریدنے میں سیکڑوں روپیہ خرچ کردیتے۔ سنسکرت شاعری کی کتب کی بابت تو وہ کہتے تھے کہ اب تک ایسی کوئی کتاب ہندستان میں نہیں چھپی جو خریدی نہ گئی ہو۔ ان کی نجی لائبریری میں ہزاروں کتابیں موجود تھیں جن میں قلمی نسخے بھی کافی تعداد میں شامل تھے۔

ان کے والد پنڈت امراؤ سنگھ شرما آریہ سماجی تھے پس سپوت بیٹے کی پبلک زندگی کا آغاز بھی آریہ سماج کے اپدیشک کی حیثیت سے ہوا جس میں وہ اچھے مقرر اور بڑے حاضر جواب نکلے۔ ان کی تحریری قابلیت اس وقت سے ظاہر ہوئی جب انھوں نے ۱۹۰۴ع میں گوروکل کانگڑی کے ہفتہ وار 'ستیہ وادی' کی ایڈیٹری اپنے ذمہ لی۔ ۱۹۰۹ع میں وہ جوالا پور کے مہاودیالیہ میں آگئے جہاں ان کی عام قابلیت کا اظہار مختلف کاموں کی صورت میں ہوا۔ وہ وہاں کے سکرٹری، پروفیسر اور 'بھارت اودے' نامی اخبار کے اڈیٹر بھی تھے۔ انھوں نے مہاودیالیہ کی خدمت بڑی لگن سے کی۔ گھر میں تھوڑی زمینداری ہوتے ہوئے ان کی مالی حالت کچھ بہت اچھی نہ تھی، پھر بھی

† پدم پراگ نام مجموعۂ مضامین سے۔ سحر

ان کی یہ خدمت زیادہ تر آنریری تھی ۔ تنخواہ تھی تو برائے نام ۔ عرصہ تک صرف پچیس روپے ماہوار ملے، پھر پچاس ہوگئے ۔ لیکن جس شخص نے اپنا ادبی شوق پورا کرنے میں اپنی ہزاروں کی جائداد تک بگاڑدی تھی اسے کام کے آگے دام کی پروا کب ہوسکتی تھی؟ انھیں (اب، رائے بہادر،) بابو شیام سندر داس نے ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی طرف سے سبھا کی ھندی لغت کی تیاری کے سلسلہ میں ایک سو ماہوار پر طلب کیا، اسی طرح پنڈت مالوی جی نے بھی ھندو یونیورسٹی میں پروفیسری کے لیے بار بار بلایا مگر وہ کہیں بھی نہ گئے ۔ وہ دل کے غنی اور بات کے دھنی تھے ۔ نہ مہاودیالیہ انھیں چھوڑنا چاھتا تھا، نہ وہ مہاودیالیہ کو چھوڑنا چاھتے تھے ۔ لارڈ بیکن کے قول کے مطابق یہ سمجھتے تھے کہ "علم کوئی بکری یا نفع کی دوکان نہیں بلکہ خالق کل کے ظہور اور انسانی تکالیف کے دفعیہ کے لیے ایک بھرا پُرا بھنڈار ھے"۔ وہ مالی تکلیف کو تکلیف نہ سمجھتے تھے ۔ ایک مرتبہ کسی رئیس نے امداد دینا چاھی تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ "بیشک آپ کی امداد آپ کی دولت کے سمندر میں قطرہ سی ھے مگر میری غیرت کو ڈبونے کے لیے وہ قطرہ سمندر سے کم نہیں ھے"۔ انھوں نے نوکری کے لیے کبھی خوشامد نہ کی ۔ انھیں اپنی آزادی کا سودا کرنا ذرا بھی پسند نہ تھا ۔ مہاودیالیہ میں وہ اپنی مرضی سے کام کرتے ہوئے اپنے کو آزاد ھی سمجھتے تھے ۔

وہ صاف‌گو بھی تھے ۔ آریہ سماج کے اثر نے اس جواھر کو اور بھی چمکا دیا تھا ۔ علمیت تھی ھی آخر وہ قدرتاً تنقید نگاری کی طرف مائل ہوئے ۔ ان کی تنقید موازنہ کے ساتھ ہوتی تھی اور ھندی میں وہ اس طرز تحریر کے موجد کہے جاتے ھیں ۔ ان کا یہ وصف سب سے پہلے "ست‌سئی سنگھار" کی صورت میں نمایاں ہوا جس میں "بہاری ست‌سئی" کی شرح لکھنے پر پنڈت جوالا پرشاد مشر مرحوم کی خاصی خبر لی گئی تھی ۔ پہلے کوئی ایک سال تک یہ تنقید قسط وار الہ‌آباد کے مشہور ھندی رسالہ سرسوتی میں چھپتی رھی پھر کتابی صورت میں بھی چھپ گئی تھی† ۔ اس کے لکھنے میں جو سخت و ترش لہجہ اختیار کیا گیا ھے وہ پسندیدہ نہیں کہا جا سکتا ۔ ایسی باتوں کا کوئی

† میں نے اس کتاب کو ایک مدت ہوئی پڑھا تھا ۔ یہ بہت ۲۰ ع کے پہلے کی ھے ۔ سحر

اچھا اثر نہیں پڑتا ، خصوصاً جب وھی باتیں ایک دل‌کش اور زیادہ موثر طریقہ پر کہی جا سکیں - مگر کچھ تو اس وقت ھندی میں تنقید نگاری کی ابتدا تھی اور کچھ شرما جی اپنی عادت سے مجبور تھے - لکھنے پر آجاتے تو اپنے دوستوں تک کو نہ چھوڑتے تھے - مگر ساتھ ھی یہ وصف بھی تھا کہ اوروں کا کہا سنا بھی خوشی سے سہہ لیتے تھے - دل میں کدورت کا نام نہ تھا - جب کبھی انھوں نے کچھ لکھا تو کسی کا دل دکھانے کی نیت سے نہیں ، بلکہ اپنے دل کا بوجھ ھلکا کرنے کے لیے -

مرحوم میں یہ وصف بھی تھا کہ جب کوئی چیز پسند آجاتی تو دل کھول کر داد دیتے تھے - آچاریہ پنڈت مہابیر پرشاد دویدی کی طرح اپنی طرف سے خط لکھ کر بھی داد دیتے اور نئے لکھنے والوں کی صورت میں ان کی قرار واقعی حوصلہ افزائی کرتے اور ضرورت پر انھیں اپنی بساط کے مطابق مالی مدد بھی دینے میں دریغ نہ کرتے تھے - جب کہیں جاتے تو وھاں کے شاعروں اور ادیبوں سے خود جاکر ملتے جس میں انھیں چھٹائی بڑائی کا مطلق خیال نہ ھوتا تھا - ان کے پاس بھی ایسے لوگوں کا کافی مجمع رھتا تھا جن کی وہ چائے سے خاطر کرتے اور پہلے سب کو پلاکر پھر خود پیتے تھے - یہی ان کا معمول تھا - چائے سے زیادہ دل بہلاؤ کا مسالہ ان کی رس بھری باتوں میں تھا جنھیں سنتے ھوئے جی نہ اکتاتا تھا - ان کی زندہ دلی کے متعلق یہاں ایک واقعہ کا ذکر کردینا مناسب معلوم ھوتا ھے - ھردوا گنج ضلع علی‌گڑھ کے رھنے والے ھندی کے نامور و کہنہ مشق شاعر پنڈت ناتھو رام شنکر شرما مرحوم سے ان کی دلی عقیدت تھی - ایک مرتبہ ان کے مکان سے چلنے کو تیار ھوئے تو شاعر موصوف کے ایک رئیس دوست نے گلقند کھلادی جو بہت لذیذ تھی - دوبارہ پھر پوچھے جانے پر پنڈت پدم سنگھ نے کہا کہ سفر کا معاملہ ھے ، کہیں زیادہ نہ ھوجائے - رئیس صاحب نے فرمایا کہ جے‌پور کی بنی ھوئی ھے ، تھوڑی اور لیجیے - غرض کہ اب کے پہلے سے بھی زیادہ کھلادی - پدم سنگھ جی نے ایک بجے کی گاڑی سے جانے کا ارادہ ظاھر کیا تو وہ بولے کہ اب آپ اس ٹرین سے نہ جاسکیں گے ، گلقند میں بھنگ تھی - پدم سنگھ جی کی آنکھیں نشہ سے سرخ ھوگئیں مگر وہ اپنے ارادہ پر اٹل رھے - اپنے ساتھی پنڈت جوالا دت شرما

سے کہا کہ ہم چلیں گے اسی ٹرین سے ، رئیس صاحب کا مطلب نہ پورا ہونے دیں گے ۔ جوالا دت جی کے پوچھنے پر کہا کہ حال تو اچھا نہیں ہے مگر مجھے اس سانپ کا منتر آتا ہے ، ابھی ایک پیالہ چائے کا پی لوں گا ۔ چنانچہ چائے پی ، کھانا کھایا اور روانہ ہوگئے ۔ مرادآباد پہنچ کر جوالا دت جی نے کہا کہ اگر آپ کے برابر میں نے گلقند کھا لی ہوتی تو مجھے کئی دنوں تک ہردواگنج ہی میں رہنا پڑتا اور شاید اسپتال کی نوبت بھی آجاتی ۔ اس پر پدم سنگھ جی ہنس کر بولے :- « ساقی بےوقوف نہ تھا ، آدمی کو پہچانتا تھا ۔ میں تو اور بھی کھا سکتا تھا ۔ بھنگ کی بات میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا » — آپ کے ساتھ چونا تمباکو کا بٹوا بھی رہا کرتا تھا جسے آپ مذاق میں « عیاری کا بٹوا » کہتے تھے ۔

مگر وہ جتنے باتوں میں تیز تھے اتنے ہی لکھنے میں سُست ۔ ان سے کچھ لکھا لینا آسان نہ تھا ، اور فرمایش پر تو کسی ایسے کام کا پورا ہونا اور بھی مشکل تھا ۔ ہاں ، لکھنے کے نام پر وہ خط لکھنا خوب جانتے تھے ۔ خط کا جواب فوراً دیتے اور اپنی ڈاک کا انتظار بھی بڑے شوق سے کرتے تھے ۔ ان کے خطوط بھی ان کی گفتگو کی طرح بہت دلچسپ ہوتے تھے جن میں اردو اشعار موقع موقع کے ساتھ کثرت سے آجایا کرتے تھے ۔ کبھی کبھی وہ اپنے خطوں میں اردو یا ہندی نثر و نظم کے تعلق سے بہت سے نازک مسئلے بھی بڑی خوب صورتی سے حل کردیا کرتے تھے ۔ ان کے خطوط کو بھی علم و ادب کا ایک قیمتی سرمایہ سمجھنا چاہیے ۔

وہ خود شاعر نہ تھے مگر شاعر کا دل و دماغ ضرور رکھتے تھے ۔ انھیں ماضی و حال کے نامی گرامی شعرا سے بےحد محبت و عقیدت تھی اور اشعار بھی اس کثرت سے یاد تھے کہ بات بات میں ان کے منہ سے نکل پڑتے تھے ۔ ذی‌حسی اور اثر پذیری کا یہ عالم تھا کہ اشعار پڑھتے ہوئے ان پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی اور آنکھوں سے آنسو بھی بہہ نکلتے تھے ۔ کبھی کبھی ان کی تحریر بھی بڑی شاعرانہ ہوتی تھی جس کا ایک نمونہ ابھی دیا جا چکا ہے ۔ ایک اور دیکھیے ۔ اپنی پدم پراگ نامی ہندی کتاب (مطبوعہ ۱۹۲۹ع) کے دیباچہ میں اپنے مضامین سے خطاب کرتے

ہوئے لکھتے ہیں :—

"اس سمے جی ٹھکانے نہیں ہے - دل کے ٹکڑے، جگر کے پارے جدا ہو رہے ہیں - ان کے آنے سے پہلے کا اور چلے جانے کے بعد کا نقشہ آنکھوں کے سامنے ہے :—

وقت مجھ پر دو کٹھن گزرے ہیں ساری عمر میں
ان کے آجانے سے پہلے اور چلے جانے کے بعد

جو مدت سے چھپے پڑے تھے، اب چھپ کر باہر نکل رہے ہیں - بہت چھپایا پر گاہکوں نے زبردستی چھین ہی لیا، کاغذ کے کونے سے کھینچ کر نمائش کے بازار میں لے ہی آئے! برسوں کا ساتھ چھوٹ رہا ہے - چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا - ممتا (موہ) لپٹ رہی ہے - بےبسی کھڑی رو رہی ہے - بھوشیہ (مستقبل) کی چنتا بےچین کر رہی ہے کہ دیکھیے باہر نکلنے پر ان غریبوں کے ساتھ کیا سلوک ہو - آدر پائیں یا دُتکارے جائیں......اچھا تھا، ایک کونے میں پھٹے پرانے چیتھڑوں میں چھپے پڑے رہتے - نظر بد سے بچے ہوئے تھے - اسی میں کشل (خیر) تھی - چمکنے کا، نمایاں ہوکر نکلنے کا، چاؤ (چاہ) سو آفتوں میں پھنساتا ہے......میرے تھے، میرے پاس پڑے رہتے......بڑی آرزوؤں سے، منتوں سے بلایا تھا - نہ جانے تمھاری آرادھنا (تمنّاؤں) میں کتنی راتوں کو دن اور کتنے دنوں کو رات کرکے تمھارے درشن نصیب ہوئے تھے - دل کا خون سکھا سکھا کر، آنکھوں کے رہٹ سے سینچ سینچ کر تمھیں ہرا بھرا کیا تھا......اب جدا ہو رہے ہو، اتنے دنوں کا ساتھ چھوڑ رہے ہو، کس دل سے کہوں اور کیسے کہوں کہ جاؤ"۔[1]

---

[1] اس سلسلہ میں پدم پراگ سے ایک اور چھوٹا سا اقتباس درج کیا جاتا ہے جو مرحوم کے (؟) ایک باموقع شعر سے تعلق رکھتا ہے :— "سب سے پہلے کان پور کے زمانہ (جنوری ۱۹۰۴ع کے پرچہ) میں میں نے ان (اکبر الہ آبادی) کی یہ کوتا (شاعری) پڑھی تھی....

فلک کے سامنے کیا منھی بہانہ چلے   چلیں گے ہم بھی اسی رخ جدھر زمانہ چلے

ایک مرتبہ میں ڈیرہ دون گیا ہوا تھا - شام کے وقت پروفیسر پورن سنگھ جی سے ملنے کے لیے گیا - وہ نہ ملے -

بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۲۸۳

سنسکرت میں گیتا اور قدیم ہندی شعرا میں انھیں تلسی اور بہاری سے دلی عقیدت تھی - زمانۂ حال کے ہندی شاعروں میں وہ پنڈت ناتھو رام شنکر شرما کو بہترین سمجھتے تھے اور پنڈت ایودھیا سنگھ اپادھیائے "ہری اودھ" اور بابو میتھلی سرن گپت کو بھی بہت مانتے تھے - فارسی میں حافظ، خیام، سعدی، مولانا روم وغیرہ اور اردو میں آزاد †، حالی اور اکبر کے بڑے مداح تھے - نثر میں خواجہ حسن نظامی کے بھی بہت قائل تھے - اردو شعرا میں اکبر کے تو وہ فدائی ہی تھے - کہتے تھے کہ "اردو اور ہندی ہی میں نہیں، بھارت کی کسی دوسری بھاشا میں بھی ایسا انقلابی شاعر بہت سمے سے نہیں ہوا" - اکبر سے شرما جی کا پہلا تعارف خط و کتابت کے ذریعہ ۱۹۱۲ء میں ہوا تھا - اس وقت سے اکبر کی زندگی میں اکثر اله آباد جاتے اور ان کے درشن سے خود کو دھنیہ مانتے تھے - اکبر کے مرنے پر وہ کبھی کبھی ان کے مزار پر پھول چڑھاکر اپنی محبت کو تازہ کر آتے - ایسے موقعوں پر وہ بے اختیار رو دیتے - اکبر کو بھی ان سے بڑی محبت تھی - کہا کرتے تھے کہ اگر میرے دل کو کسی نے سمجھا ہے تو پنڈت جی نے - یہ بھی فرماتے تھے کہ "کبھی تو پنڈت جی میرے اشعار سے ایسے معنی نکالتے ہیں کہ خود مجھے تعجب کرنا پڑتا ہے" -

---

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۲

'کچھ دیر انتظار کرکے چلا آیا' - میں نے پنسل سے کاغذ کے ٹکڑے پر یہ شعر لکھا اور کمرہ کے دروازے کی چک (چق) میں رکھ دیا' :

نصیب ہو نہ سکی دولت قدم‌بوسی ادب سے چوم کے حضرت کا آستانہ چلا

.... اس کے بعد جب پروفیسر .... جی ملے تو کہتے تھے کہ "اس شعر کو پڑھ کر میں رات بھر بےقرار رہا - مزے لےلے کر بار بار پڑھتا اور جھومتا تھا - ایک کیفیت طاری ہوگئی - تمام رات نیند نہ آئی - دل چاہتا تھا کہ ابھی چل کر ملوں پر معلوم نہ تھا آپ کہاں ٹھہرے ہیں - آپ نے مجھے غیرحاضری کی یہ اچھی سزا دی" -

† شرما جی کے مجموعۂ مضامین (پدم پراگ) میں آزاد پر ایک پورا مضمون ہی ملتا ہے جس کے ایک ضروری اقتباس کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے :—

"آزاد میں ایک ایسا نایاب وصف تھا جو دوسرے مسلمان لکھنے والوں میں نہیں پایا جاتا - ان میں

اکبر صاحب شرما جی کے کتنے بڑے قدرداں تھے، یہ خود ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔ چند خطوں کی چند ضروری سطریں درج ذیل ہیں:—

(۱) "......آپ کا الطاف نامہ اس وقت پیش نظر ہے۔ ماشاءاللہ آپ کیا جیتی جاگتی اردو لکھتے ہیں......"

(۲) "......آپ کا عنایت نامہ ایسا ہے کہ اس کا جواب دو حرفوں میں دینا ستم ہے....میرے بعض احباب آپ کی تحریر سن کر پھڑک گئے"۔

(۳) "....آپ کے خط کو آنکھیں ڈھونڈھتی تھیں۔ مدت کے بعد عنایت نامہ آیا۔ بہت مسرت ہوئی۔ خدا کرے آپ کے درشن بھی نصیب ہوں......آپ کی قابلیت اور سخن فہمی نے مجھ کو آپ کا عاشق بنا دیا ہے......" (مورخہ ۲۲-۱-۱۸ع)۔

(۴) "....آپ کا دیدار میرے لیے غذاے روح ہے۔ بیماری و ناتوانی سے ناچار ہوں ورنہ آپ ہی کے انسٹی ٹیوشن (مہاودیالیہ جوالاپور) میں دھونی رماتا......"۔

شرما جی کو بھی اکبر کا رنگ کچھ ایسا پسند آ گیا تھا کہ وہ ہندی کی ادبی دنیا کو اس سے اچھوتا نہ رکھ سکتے تھے۔ خود لکھتے ہیں:— "ہندی دنیا کو اکبر سے روشناس کرانے کی سعادت سب سے پہلے مجھ ہی کو نصیب ہوئی۔ جب میں نے اپنے مضامین میں اکبر اور دیگر اردو شعرا کے اشعار دینے شروع کیے تو خالص پنڈتاؤ (عالمانہ) ہندی کے کئی حمایتی بگڑ اٹھے تھے......مگر آگے چل کر یہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۳

جوہر شناسی اور کشادہ دلی کا خاصہ تھا۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں جگہ جگہ سنسکرت، بھاشا اور شعراے متعلقہ کی اور ساتھ ہی ہندی شاعری کی فراخ دلی سے تعریف کی ہے۔ اپنے تاریخ اردو والے مضمون میں ہندو، پارسی اور بدھ مت والوں کے نام لیتے بڑے آدر (احترام) سے لیتے ہیں کہ (ایک) ہندو مصنف بھی اپنے دوسرے ساتھ والے ہندو مصنف کا نہیں لیتا"۔

رواج چل پڑا......اور اب تو اردو کی طویل نظمیں هندی میں برابر چھپتی هیں؟
(ترجمه هندی سے)

اس کا ذکر شرما جی نے اپنے کسی خط میں کیا هوگا جس کے جواب میں جناب اکبر نے تحریر فرمایا تھا:

« آپ نے میرے ناچیز اشعار کی بڑی قدر کی که هندی تصنیف میں ان کو داخل کیا......میں چاهتا هوں که آینده هندی کے خوبصورت اور سبک اور معنی خیز الفاظ کو زیاده تر اردو میں داخل کروں ۔ افسوس هے که میں نے هندی نهیں پڑھی ۔ امید هے که کوئی ذی علم دوست مدد دیں » ۔

جس طرح شرما جی اکبر کے شیدائی تھے ' ویسی هی چاهت انهیں برج بھاشا کے قدیم شاعر بهاری لال کے ساتھ تھی ۔ بهاری خصوصاً حسن و عشق کا شاعر هے اور اس فن میں وه اپنا جواب نهیں رکھتا ۔ شرما جی بھی عشقیه شاعری (سنگار رس) کو اور قسم کی شاعری پر ترجیح دیتے تھے ۔ انھوں نے بهاری کی مشهور و معروف کتاب « بهاری ست‌سئی » کی شرح لکھی هے ۔ ایک دوست کے دریافت کرنے پر کها که « یه رس (سنگار) نو رسوں * سے برتر و بالا هے ۔ ساهته (ادب) کا خاص رنگ (جزو) هے ۔ اور پھر بهاری کا کمال اتنا زبردست هے که انھوں نے دوها جیسے چھوٹے چھند میں 'گاگر میں ساگر ' (کوزه میں دریا) بھر دینے کا سا کام کیا هے ۔» اپنی اسی شرح کے طویل دیباچه میں بھی لکھتے هیں :— « بهاری کی شاعری میں جتنی جادو بیانی اور دل‌کشی هے اسی قدر وه گھری اور وزن دار بھی هے......پهلے پرانے خیال کے 'کھوسٹ ' اس پر جیسے لٹو تھے ' آج نئی روشنی کے پروانے بھی ویسے هی سو جان سے فدا هیں ۔ وقتاً فوقتاً کتنے هی شعرا و علما نے اس پر نظم و نثر میں سنسکرت

* قدیم هندی شعرا نے اپنی طبع آزمائی کے لیے نورس (کیف) مانے هیں جو ترتیب کے ساتھ ان امور سے تعلق رکھتے هیں :— (۱) عشق (اسی میں بزمیه شاعری بھی شامل هے) ' (۲) ظرافت یا طنز ' (۳) رنج و الم ' (۴) غیظ و غضب ' (۵) همت و حوصله ' (۶) خوف ' (۷) نفرت ' (۸) حیرت و استعجاب ' (۹) معرفت ۔

سعر

اور ھندی میں شرحیں لکھیں مگر اس کی متانت ابھی ویسی ھی برقرار ھے۔ اس کے جوھر پوری طرح کھلنے میں نہیں آئے، گہرائی کی تھاہ نہیں ملتی۔ پہلے کی شرحوں سے پڑھنے والوں کی آسودگی نہ ھوئی، نئی شرحیں بنیں پھر بھی چاہ یہی ھے کہ اور بنیں"۔

اسی دیباچہ میں مرحوم نے سنگار رس (عشقیہ کیف) کے عام ھندی شعرا کے حوالہ سے کچھ ایسی باتیں بھی کہہ ڈالی ھیں جو قابل غور ھیں۔ فرماتے ھیں:- "چاھے اپنی رائے میں اسے دیش کا 'ابھاگ' ھی سمجھیے کہ ھمارے شعرا...ایسی سندر بھاشا کا 'برا استعمال' ایسی بھرشت بات کے بیان کرنے میں کیوں کر گئے' مگر جو کرگئے سو کرگئے' جو ھوگیا سو ھوگیا۔ وہ سمے ھی کچھ ایسا تھا' سماج کی پسند ھی کچھ ایسی تھی اور اب دوبارہ ایسے شعرا یہاں پیدا ھونے سے رھے جو موجودہ مہذب سوسائٹی کی پسند کے مطابق وقتی باتوں کی ایسی سندر' میٹھی' اونچی اور پھڑکتی ھوئی جان‌دار اور پرکیف زبان میں بیان کرکے مردہ دلوں میں جان ڈال جائیں....ھماری بھاشا کی بہار بیت گئی۔ اب کبھی ختم نہ ھونے والی خزاں کے دن ھیں....جس بےکیف اور بےجان بھاشا میں نرس اور کان پھوڑ چھندوں کی آج کل پیدائش ھورھی ھے' اس سے پسندیدگی کا پرچار ھوچکا' یہ دل والے سماج کے دل میں گھر چکی! یہ سوکھی ٹھنی ادب کی فضا میں بہت دن کھڑی نہ رہ سکےگی....اس کے خشک جسم میں قدیم علم و ادب کے رس کا پہنچنا بہت ضروری ھے....اگر اپنی زبان کو زینت دینا ھے تو شعر و سخن کے اس پرانے باغ سے جسے ھزاروں ھوشیار مالیوں نے سیکڑوں برس تک دل کے خون سے سینچا ھے' سدا بہار پھول چننے ھی پڑیں گے"۔

ست‌سئی کی شرح کا یہ دیباچہ ۲۴۸ صفحوں میں ھے اور ایسے ایسے کتنے ھی انمول جواھرات سے بھرا پڑا ھے۔ مولف کی بےساختہ اور معنی خیز تحریر نے جا بجا وہ رنگینی پیدا کردی ھے کہ دیکھتے اور سراھتے ھی بنتی ھے۔ مجموعی طور پر یہ دیباچہ ایک ادبی تنقید کی حیثیت رکھتا ھے جس میں بہاری کے دوھوں کا سنسکرت' ھندی' اردو اور فارسی کے نامور شعرا کے کلام کے ساتھ بڑی خوبی سے موازنہ کرتے

ہونے بہاری کو فوقیت دی گئی ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک ایسا ہی موازنہ ملاحظہ ہو جو اردو اور فارسی سے تعلق رکھتا ہے:-

"ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے" (غالب)

.....اس شعر کی مولانا حالی نے بڑی تعریف کی ہے۔ دیوان حالی کے مقدمے اور یادگار غالب میں اسے لےکر دکھایا ہے کہ یہ شعر شاعر کی نازک خیالی کا بڑھیا نمونہ ہے ....اس کے ساتھ ایک شعر شیخ سعدی کا یہ لکھا ہے:

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم
چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

....حالی کہتے ہیں کہ ان دو شعروں کا مطلب تو یہی ہے کہ کسی طرح اپنا دکھ یا درد معشوق پر ظاہر نہیں کیا جاسکتا مگر سعدی کے بیان میں یہ شبہہ باقی رہ جاتا ہے کہ ممکن ہے معشوق اپنے عاشق کی ظاہری بدحالی دیکھ کر سمجھ جائے کہ اس کا دل دکھی ہے، کیوں کہ سعدی کے بیان سے صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ معشوق کے آنے سے غم جاتا رہتا ہے نہ یہ کہ ظاہری حالت بھی بدل جاتی ہے۔ مگر مرزا غالب کے بیان میں یہ شبہہ بھی نہیں رہتا۔ پھر بھی سعدی کے شعر کو مرزا کے شعر پر ترجیح دینی چاہیے کیوں کہ وہ اس سے پہلے کا ہے۔ یہ تو ہوئی شیخ سعدی اور مرزا غالب کی بات، اب دیکھیے برج بھاشا کے....کوی راج (ملک الشعرا) بہاری لال اسی بات کو غالب سے پہلے کیسے اچھے اور نرالے ڈھنگ سے کہتے ہیں: جو واکے تن کی دسا دیکھیو چاہت آپ۔ تو بل نیک بلوکئیے چل اوچک چپ چاپ * (دوہا) یعنی اگر آپ اس فراق زدہ کے بدن کی حالت دیکھنا چاہتے ہیں تو بلہاری، ذرا اچانک اور چپ چاپ چل کر دیکھیے۔ اگر آپ کے پہنچنے کی اسے خبر ہوگئی تو اس کی لاغری اور کمزوری دور ہوکر اسے صحت مل جائےگی، پھر اس کی جدائی سے پیدا ہوئی حالت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ آپ کو نہ ہو سکےگا۔ اس لیے میری بنتی ہے کہ اچانک اور

* जो वाके तन की दसा देख्यो चाहत आप, तो बलि नैकु बिलोकिये चलि औचक चुपचाप।

چپ چاپ چل کر اسے دیکھیے....' ہماری رائے میں یہ دوہا اوپر کے دونوں شعروں سے بہت بڑھ کر ہے۔ ان شعروں سے تو یہی پایا جاتا ہے کہ معشوق کے پہنچنے یا اسے دیکھنے پر ہی عاشق کی حالت بدل جاتی ہے مگر دوہے میں 'اوچک چپ چاپ' لفظوں سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگر اچانک اور چپ چاپ نہ چلے اور کسی طرح تمھارے چل پڑنے کی خبر بھی اس تک پہنچ گئی تو تمھارے پہنچنے سے پہلے' اس خوش‌خبری کے پہنچتے ہی اس کی حالت اور سے اور ہو جائے گی....'۔

صرف دیباچہ ہی نہیں ' اسی قسم کا قابل قدر موازنہ ست سئی کی شرح میں بھی جاری رکھا گیا ہے جو متعدد کتب کے حوالہ سے مرتب ہوئی ہے۔کل کتاب سے شرما جی کے وسیع مطالعہ اور زبردست علمی تبحر کا پتہ چلتا ہے۔ افسوس کہ وہ صرف ۱۲۶ دوہوں کی تشریح کر سکے جو یکم مارچ سے ۱۵ اپریل ۱۴ ع تک کے قلیل وقت میں دریائے گنگا کے کنارے پر آہار ضلع بلند شہر میں لکھی گئی تھی۔ اگرچہ شرما جی وہاں یہ سوچ کر گئے تھے کہ کتاب کے کل سات سو سے زائد دوہوں کو ختم ہی کرکے اٹھوں‌گا مگر پھر وہ سلسلہ نہ اس وقت تک جاری رہ سکا اور نہ آگے کبھی لکھنے کی نوبت آئی۔ تاہم صرف ۱½ ماہ کے بہت تھوڑی مدت کو دیکھتے ہوئے جو کچھ ہوا بہت ہوا۔ یہ ادھوری شرح بھی اتنی اچھی سمجھی گئی کہ ۱۹۲۳ ع میں ہندی ساہتہ سمیلن نے اس کے ادھورے پن کا خیال نہ کرتے ہوئے اپنا 'منگلا پرشاد انعام' نامی بارہ سو روپے کا سالانہ انعام اول اول اسی کتاب کی نذر کرکے اپنی قدردانی اور جوہر شناسی کا ثبوت دیا تھا—

شرما جی کو مشاعروں اور کوی سمیلنوں (ہندی مشاعروں) سے بھی بڑی دل‌چسپی تھی مگر سمیلنوں میں انھیں اتنا لطف نہ آتا تھا جتنا مشاعروں میں۔ کہتے تھے کہ ہندی شعرا میں وہ دلی لگن اور محنت و مشقت کی عادت نہیں ہے جو شعرا کے لیے بہت. لازمی ہے اور کوی سمیلنوں کو کامیاب بنانے کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہ کامیابی اردو مشاعروں کو کیوں نصیب ہوئی ہے' اس پر مرحوم نے اپنی آل انڈیا ہندی ساہتہ سمیلن

مظفرپور کی صدارتی تقریر میں کچھ روشنی ڈالی تھی - فرمایا تھا کہ « اردو شعرا نے حالی کے رنگ کو اپنا لیا ہے بلکہ اسے اور چمکا دیا ہے - اردو اخبارات میں دیش بھکتی (حب‌الوطنی) اور معرفت کی جو نظمیں نکلتی ہیں وہ پڑھنے والے....کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، دل پر اثر کرتی ہیں، بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے - ہندی کی نئی رچناؤں (نظموں) میں یہ بات ابھی نہیں آئی....اردو والے شعروں میں جذبات و خیالات کا نیا پن بھرتے ہیں مگر بھاشا اور ریت وہی پرانی ہی ہے - ان کی گاڑی کی رفتار بدل گئی ہے....پر دھرا اور پہیے بدستور وہی ہیں »۔ †

ایک بات اور ــ آج کل نئی ہندی میں بلا قید وزن یا ردیف و قافیہ نظمیں لکھنے کا رواج ترقی پا رہا ہے - انگریزی شاعری کی نقل میں یہ شوق بڑھتے بڑھتے اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ خشک نثر کی صورت اختیار کرتے ہوئے خبط کی حد تک جا پہنچی ہے - پرانی قیود کو بالکل مٹا دینے اور رسمی و رواجی بندش سے یک لخت آزاد ہوجانے کی دھن میں یہ خیال مطلقاً باقی نہیں کہ آخر قدیم شعرا نے جو طرز قایم کیا ہے اس میں کچھ نہ کچھ مصلحت اور دور اندیشی تو ضرور ہے اور نثر و نظم میں کوئی امتیازی خصوصیت تو ہونی ہی چاہیے :شرما جی بھی اس امتیاز کے قائل تھے اور انھوں نے صوبائی ساھتہ سمیلن ۱۹۲۰ء کے موقع پر اپنی صدارتی تقریر میں اس امر سے متعلق یوں فرمایا تھا :— « تک نہ ملی، قافیہ تنگ ہوگیا تو اس جھنجھٹ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے ؟ بےتکی اڑانے لگے - جب سنسکرت میں بےتکی کوِتا ہوتی

---

† دھرا اور پہیے کے متعلق شرما جی نے حالی کے مقدمہ کا ایک اقتباس بھی لیا ہے جو یوں ہے :—
" آج کل دیکھا جاتا ہے کہ شعر کے لباس میں اکثر نئے خیالات جو ہمارے اگلے شعرا نے کبھی نہیں باندھے تھے، ظاہر کیے جاتے ہیں - مگر چونکہ وہ اس خاص زبان میں جو شعرا کی کثرت استعمال سے کانوں پر رچ گئی ہے ادا نہیں کیے جاتے بلکہ نئے خیالات جن الفاظ میں براہ راست ظاہر ہونا چاہتے ہیں، انھیں الفاظ میں ظاہر کرائے جاتے ہیں اس لیے وہ مقبول خاص و عام نہیں ہوتے.... ناظرین کو معلوم رہے کہ جب کسی ملک یا قوم یا شخص کے خیالات بدلتے ہیں تو خیالات کے ساتھ طرز بیان نہیں بدلتی - گاڑی کی رفتار میں فرق آجاتا ہے مگر پیّہ اور دھرا بدستور باقی رہتا ہے »۔

ہے ' انگریزی میں 'بلینک ورس' ہے تو پھر ہندی میں وہ کیوں نہ ہو؟ اچھا صاحب یہ بھی سہی! بےتکی ہی سہی ' پر کچھ کہیے تو! نرے شبد اڈمبر (لفظی نمائش) اور کوری تک بندی کا نام تو کوتا نہیں ہے ۔ کوتا کا پران جو رس ہے اس کی کوئی بوند بھی آپ کے پیالے میں ہے یا نہیں؟.... چوٹ کھائے ہوئے دل سے جو کوتا نہیں نکلتی وہ سیاہی کی نائن کا رونا ہے " ۔

آج کل رمزیہ شاعری کا بھی زمانہ ہے ۔ ہندی شعرا کے نو رسوں والی بات تو اب رخصت ہوگئی اور اس کے ساتھ وہ طرح طرح کی حالتوں اور کیفیتوں والی بات بھی جو زندگی کے مختلف پہلوؤں کو شاعری کے لطیف و موثر پیرایہ میں سامنے رکھتی ہوئی شاعری اور ندگی میں بہت کچھ مشابہت و مماثلت پیدا کردیتی تھی ۔ البتہ اگر باقی ہے تو سنگاررس ۔ ۔لنے شاعروں کا خواہ جس قدر مضحکہ اڑایا جائے اور ان کی شاعری کو عشقیہ کہہ کر چاہے جتنا بھی بدنام کیا جائے مگر سچ پوچھیے تو وہی حسن و عشق کا راگ آج بھی گایا جارہا ہے' ہاں آواز میں ایسی کنکناہٹ یا جھنجھناہٹ ضرور آگئی ہے کہ وہ کانوں میں پڑ کر دل و دماغ میں سرایت نہ کرسکے بلکہ دونوں کو ایک جمود کی سی حالت میں ڈال دے! میں نے ایک مرتبہ نئی ہندی کی مشہور و معروف شاعرہ شریمتی مہادیوی ورما ایم ۔ اے (پرنسپل مہلا ودیا پیٹھ الہ‌آباد) سے باتیں کرتے ہوئے پوچھا کہ آخر یہ رہسیہ واد (رمزیہ شاعری) کیا ہے؟ برجستہ جواب ملا کہ "وہ شاعری جو سمجھ میں نہ آئے" ۔ خیر' اسے کچھ مبالغہ بھی سمجھیے' اگرچہ حال کے ہندی شعرا نے اسے کچھ ویسا ہی ضرور بنادیا ہے ۔ فی زمانہ اس جدید نوعیت کی شاعری کو ہند کے مایۂ ناز و شہرۂ آفاق بنگالی شاعر ڈاکٹر ٹیگور نے رواج دیا جس کا عام تتبع ہندی شعرا نے بھی کیا اور اردو شعرا نے بھی' مگر آج جو صفائی اور کامیابی اردو میں نظر آتی ہے وہ ہندی میں قریب قریب مفقود ہے ۔ شرما جی نے آل انڈیا ساہتہ سمیلن کی صدارت کرتے ہوئے اس پر بھی خیالات کا اظہار فرمایا تھا ۔ ملاحظہ ہو:-

" رہسیہ واد ہو یا چھایا واد ' وہ سمجھ میں تو آنا ہی چاہیے ۔ آخر اپنشدوں کا پرم رہسیہ (اعلیٰ رمز) بھی تو سمجھ میں آتا ہے...........میں رہسیہ واد

کا پرم پریمی ہوں - اس کی کھوج میں رہتا ہوں - کہیں مل جاتا ہے تو وجد کی سی حالت میں پہنچ جاتا ہوں - سر دھنتا ہوں اور مزے لے لے کر پڑھتا ہوں - جی کھول کر داد دیتا ہوں - دوسروں کو سناتا ہوں - پر ہندی کی نوین (نئی) رچناؤں میں ایسا رھسیہ واد کم ، پیسے میں پائی سے بہت کم ، سو بھی کبھی کسی رچنا میں ملتا ہے اور وہ بھی اس درجہ کا نہیں جیسا اردو میں تصوف کا رنگ ہے - "

ظاہر ہے کہ شرما جی کو نہ کسی رسم و رواج سے اندھا لگاؤ تھا اور نہ وہ ' بلینک ورس' یا ' رھسیہ واد ' سے کوئی ' بغض للّٰہی ' رکھتے تھے - وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ شاعری واقعی شاعری ہو اور ایسے معنی مطلب کے ساتھ جو سہولت سے سمجھ میں آسکے † - دل کے چھپے ہوئے جذبات کو باہر لا کر ایک ایسی شکل میں پیش کرنا جو دیکھنے ، سننے اور سمجھنے کے لائق ہو ، یہی کسی لکھنے والے کا خاص کام ہونا چاہیے - شہرۂ آفاق انگریز نقاد میتھو آرنلڈ کا کہنا ہے کہ " شاعری اصل میں زندگی کی تنقید ہے اور شاعر کی عظمت کا دار و مدار اسی پر ہے کہ وہ خیالات کا خوبصورت اور زور دار طریقہ پر زندگی سے تعلق پیدا کرائے " - شعرا بھی بالعموم اس بات کو مانتے ہیں اور اسی پر چلنے کا دعویٰ تک کرتے ہیں مگر یہ سوچنے کی تکلیف نہیں اٹھاتے کہ جب ان کی بات سمجھ ہی میں نہ آئے گی تو آخر عام انسانی زندگی پر اس کا اثر ہی کیا اور کیسے پڑ سکے گا ؟ شرما جی کا بھی کم و بیش یہی خیال تھا اور جب انھوں نے ساہتیہ سمیلن کے اجلاس میں وہ باتیں کہیں جو ابھی لکھی جاچکی ہیں تو بڑا شور شرابا ہوا - مگر سچ تو یہ ہے کہ نہ ان میں قدامت پسندی کا شائبہ تھا ، نہ نکتہ چینی یا عیب جوئی کا - وہ وقتی رجحان کو خوب سمجھتے تھے اور وقتی بات کے کہہ دینے میں لگی لپٹی روا نہ رکھتے تھے -

اب لگے ہاتھوں ترجمہ کے متعلق بھی شرما جی کے خیالات کا جائزہ انھیں کے شاعرانہ الفاظ میں لے لیجیے :- " اصل میں کوتا (شاعری) ترجمہ کرنے کی چیز ہے ہی نہیں - ترجمہ میں کوتا کی آدھے سے ادھک سندرتا نشٹ ہوجاتی ہے - ایک بھاشا کی کوتا دوسری بھاشا میں آکر کوتا نہیں رہتی - یہ شراب اپنے مٹکے سے نکلی اور

سر کہ ہوئی ۔ یہ راگ ایک گلے سے دوسرے گلے میں اترتے ہی بے سرا ہوجاتا ہے ۔ یہ عکس ایک درپن (آئینہ) سے دوسرے میں آیا اور پرچھائیں بن کر رہ گیا !" † ۔

جہاں تک مجھے علم ہے ، مرحوم کی تین کتابیں (۱) ست سئی سنگھار ، (۲) ست سئی کی شرح اور (۳) پدم پراگ ، ان کی زندگی میں شایع ہوگئی تھیں ۔ ان کے متفرق مضامین کی تعداد بہت زیادہ تھی جس کے لیے پدم پراگ کا دوسرا حصہ بھی چھپنے والا تھا ، مگر ان کی وفات کے بعد پھر اب تک کسی نے اس طرف توجہ نہ کی ۔ میں اس کو ادبی بدقسمتی سمجھتا ہوں جو نہ صرف مرحوم کے متعلق ایک مجرمانہ سہو ہے بلکہ جس سے علم و ادب کی دنیا میں بھی ایک کھٹکنے والی کمی محسوس ہو رہی ہے ۔ معلوم نہیں کہ اب تک اس کا مسودہ بھی کہیں محفوظ ہے یا نہیں ۔ میرے خیال میں تو مضامین کے علاوہ ان کے خطوط بھی اس قابل ہیں کہ زیادہ نہیں تو کم سے کم ایک انتخاب ہی کی صورت میں چھاپ دیے جائیں ۔

شرما جی اپنے وقت کے ماہوار ہندی رسالوں میں وشال بھارت (کلکتہ) کو بہترین مانتے تھے ۔ اخباروں میں پرتاپ (کانپور) کے متعلق ان کی رائے تھی کہ اس نے اپنے سابق اڈیٹر شریجت گنیش شنکر ودیارتھی کے زمانے میں اپنی آن بان خوب نباہی ۔ جہاں ان کی یہ ہدایت تھی کہ بلا معاوضہ ایک سطر بھی نہ دی جائے وہاں وہ خود یہ نہ چاہتے تھے کہ ان کا ہر کام معاوضہ کے ساتھ ہو ۔ طلبا کو بڑے شوق سے پڑھاتے تھے اور ان سے کچھ لینا تو دور کی بات اپنے پاس سے انھیں کچھ دیتے رہنے میں بھی تامل نہ کرتے تھے ۔ وہ خود بہت سادہ زندگی گزارتے تھے ۔ سودیشی کے پریمی تھے اور اس "گاندھی جگ" کے بہت پہلے سے گھر کے کتے سوت کا گاڑھا پہنا کرتے تھے ۔ سیاسیات میں کوئی عملی حصہ نہ لیتے ہوئے لوکمانیہ تلک کو سب سے بڑھ کر مانتے تھے ۔ ساتھ ہی ہندو مہاسبھا کے بھی معتقد تھے ۔

وہ آریہ سماجی ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو چند مقررہ اصولوں کے دائرہ میں محدود کردینا گوارا نہ کرسکتے تھے ۔ مذہبی معاملات میں سوامی دیانند سرسوتی

† اردو ترجمہ کی غرض سے صرف تین چار لفظ بدلے گئے ہیں ۔ سحر

سے تو انھیں قدرتاً بڑی گہری عقیدت تھی مگر ساتھ ھی وہ سوامی رام تیرتھ کو بھی بڑی بھکتی کی نگاہ سے دیکھتے اور کہا کرتے تھے کہ ان کا سا اعلیٰ کردار والا اور بلند خیال انسان دوسرا نہیں ملا ۔ کسی مذہب کی برائی کرنا انھیں پسند نہ تھا ۔ گنگا نہانے کا بھی شوق تھا اور وہ پاک و صاف مقاموں میں پاک و صاف ہوکر ھی جانا مناسب سمجھتے تھے ۔ جب کبھی بنارس جاتے تو اپنے گرو پنڈت کاشی‌ناتھ کی خدمت میں زمیں‌بوس ہوکر آداب بجا لاتے اور کچھ نہ کچھ نذر کی صورت میں بھی پیش کرتے ۔ بزرگوں کا ادب اور عالموں کی عزت و توقیر کرنا اپنا مقدم فرض سمجھتے تھے ۔ بہت سی باتوں میں قدیم آرین تہذیب کے پیرو ھوتے ھوئے وہ گوروکلوں کی موجودہ رفتار سے مطمئن نہ تھے ۔ یہ سب تو تھا ھی، مگر سب سے بڑھکر یہ بات تھی کہ وہ سراپا ایک ادبی انسان تھے ۔ ادب ھی ان کے گیان کی چیز تھی اور دھیان کی بھی ۔ اسی کی پوجا تھی اور اسی کی تپسیا ۔ وہ اسی کے لیے پیدا ھوئے، اسی کے لیے جیے اور اسی کے لیے مرے! یہی خاص وجہ تھی کہ وہ اتنے فراخ دل اور وسیع الخیال واقع ھوئے تھے ۔

افسوس کہ علم و ادب کا ایسا زبردست اور بےلوث خادم صرف پچپن سال کی عمر میں موت کے بےدرد ھاتھوں ھم سے دفعتاً چھین لیا گیا ۔ شرما جی ھندستانی اکیڈمی میں اپنی تقریر ختم کرکے اور معاوضہ لینے کے بعد ۲۰ مارچ ۱۹۳۲ع کو اپنے گاؤں پہنچے تھے ۔ وھاں اس وقت پلیگ کا زور تھا ۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل‌کر گاؤں کے باھر بس رھے تھے ۔ شرما جی سے بھی گھر چھوڑکر باھر بسنے کے لیے کہا گیا، مگر ان کا تقدیر پر اٹل بھروسا تھا جس کے آگے انھیں کسی خطرے کی پروا نہ تھی ۔ ھاں، اس وقت انھیں فکر تھی تو صرف گاؤں والوں کی دوا دارو کی اور گاؤں میں ایک بار پہنچ جانے پر وہ خود کو اس خدمت سے محروم کیوں کر رکھ سکتے تھے؟ انھوں نے ۲۳ مارچ کو اپنے ایک دوست کو لکھا تھا کہ "گاؤں میں ابھی پلیگ کا زور کم نہیں ھوا........ میں جب تک گاؤں میں رھتا ھوں، وید حکیم بننا پڑتا ھے ۔ گاؤں کے غریب لوگ دوا دارو کی امید سے آتے ھیں، انھیں چھوڑکر باھر جانے کو جی نہیں چاھتا ۔

لمبے سفر سے تھک رہا ہوں، آرام کرنا چاہتا ہوں اور جو ہوگا دیکھا جائےگا " ۔

ہونا اور کیا تھا؟ وہ آرام کرنا چاہتے تھے۔ قدرت انھیں لمبا، ان کے سفر سے کئی گنا لمبا، آرام دینا چاہتی تھی۔ اسی کا سامان ہورہا تھا۔ ۲۷ مارچ کو وہ خود پلیگ میں مبتلا ہوئے اور اس کے ٹھیک گیارھویں دن ۷ اپریل ۱۹۳۲ء کو صبح کے وقت ان کی روح ان کے جسم کو چھوڑکر ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی۔ ہمارا ملک اور خاص‌کر ہمارا صوبہ ایک ایسے عظیم شخص سے خالی ہوگیا جس نے اپنی تمام عمر ادبی خدمت میں گزارکر آخر عوام کی خدمت کرتے ہوئے اپنے آپ کو قربان کردیا!

مرنے کے دو روز قبل تک ان کے ہوش و حواس بالکل درست رہے اور علمی مطالعہ یا مشغلہ کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ دو ہی دن پہلے تک انھیں گیتا اور رامائن کا خیال نہ بھولا۔ انھوں نے اپنے لڑکے سے رس مانگا۔ بیماری میں انار اور سنترہ کا رس دیا جاتا تھا، وہی لایا گیا۔ اس وقت شرما جی نے کہا کہ " اسے رس مت کہو، اس سے میری پیاس نہیں بجھتی۔ مجھے تو اب گیتا اور رامائن کا رس پلاؤ، اسی سے مجھے شانتی ملےگی۔ یہی وہ آخری الفاظ تھے جن میں مرحوم کی علم پرستی اور خوش رغبتی کا ملے جلے طور پر ایک عام اظہار ہوا تھا* ۔

---

* اس مضمون کی تکمیل میں ذیل کی کتابوں اور رسالوں سے مدد لی گئی ہے جس کا دلی شکریہ کے ساتھ اعتراف کیا جاتا ہے :

پنڈت پدم سنگھ شرما کی لکھی ہوئی (۱) بہاری ست‌سئی کی شرح ' (۲) پدم پراگ (مجموعۂ مضامین) اور (۳) ہندی ' اردو اور ہندستانی (مطبوعہ ہندستانی اکیڈمی یو-پی ' الہ‌آباد) ' وشال بھارت (کلکتہ) کا پدم سنگھ شرما نمبر ' سینک (آگرہ) کا پدم سنگھ شرما نمبر ' مادھوری (لکھنؤ) وغیرہ ۔

سحر ہتگامی

تبصرے

ادب

The Basic Words. English-Hindustani
Published for the Orthological Institute (India)
by the Times of India Press, Bombay.

یہ انگریزی کے بنیادی لفظوں کی لغت ہے' جسے ٹائمز آف انڈیا پریس بمبئی نے مسٹر اڈولف مائرز (Mr. Adolph Myers) کی نگرانی میں شایع کیا ہے۔ ۳۱۱ صفحوں کی کتاب ڈمائی سائز پر ٹائپ میں چھاپی گئی ہے۔ طباعت اچھی ہے کتاب مجلد ہے۔ قیمت درج نہیں۔

مقدمہ میں مسٹر مائرز نے بتایا ہے کہ جو لوگ انگریزی سیکھنا چاہتے ہیں ان سے تین منزلیں طے کرائی جاتی ہیں: (۱) پہلی منزل میں بنیادی انگریزی کے ۸۵۰ لفظ اور ان سے جملے بنانے کی ترکیبیں بتائی جاتی ہیں۔ اس طرح مختلف مضامین کی کتابوں کے پڑھنے کی استعداد پیدا کرائی جاتی ہے۔ (۲) دوسری منزل میں بنیادی لفظوں اور محاوروں کو رواں کرانے کے لیے کثرت سے بنیادی انگریزی کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ اس منزل میں زیر نظر لغت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور چونکہ یہ بنیادی زبان کے تمام محاوروں پر حاوی ہے اس لیے یہ "سونا ہی سونا ہے اس میں ذرا بھی کھوٹ نہیں"۔ لہذا دوسری لغتوں کی نسبت یہ بہت زیادہ کارآمد اور ضروری ہے۔ (۳) تیسری منزل معیاری انگریزی کی ہے۔ اس لغت کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔

مقدمے میں یہ دعویٰ بھی ہے کہ « انگریزی کا ترجمہ « بنیادی ہندستانی » میں دیا گیا ہے اور وہ صرف ایک ہزار لفظوں پر مشتمل ہے اور ہر ایک ہندستانی جاننے والا انھیں ضرور جانتا اور سمجھتا ہے » - لیکن جس طرح بنیادی انگریزی کی کتابوں میں ہزار لفظوں کی مکمل فہرست شروع میں ایک ہی صفحے میں چھاپ دی جاتی ہے، بنیادی ہندستانی کے لفظوں کی کوئی فہرست اس کتاب میں نہیں ہے -

غرض کہ اس کتاب کا کام یہ ہے کہ جو لوگ بنیادی انگریزی سیکھنا چاہیں اور ہندستانی زبان سے واقف ہوں، وہ بہت آسانی سے انگریزی زبان سیکھ لیں اور اگر کوئی محاورہ یا لفظ ان کی سمجھ سے باہر ہو تو بلاتردد اس مختصر سی لغت میں انھیں مل جائے - فی نفسہٖ یہ کام بہت اچھا تھا اور آسان انگریزی کو ہندستان میں پھیلانے کا ذریعہ بن سکتا تھا، لیکن بدقسمتی سے ہندستان کے ڈائرکٹر مسٹر مائرز ہندستانی زبان سے قطعی بےبہرہ معلوم ہوتے ہیں اور ان کی اس کوشش کا نتیجہ سعیٔ لاحاصل معلوم ہوتا ہے -

ظاہر ہے کہ اس لغت کا یہ مقصد نہ تھا کہ وہ ہندستانی زبان کے حدود کو متعین کرتی - لیکن نگران کا یہ فرض اولین تھا کہ وہ جان لیتا کہ ہندستانی زبان کہتے کسے ہیں ؟ خود انگریزی زبان میں ہندستانی کی اتنی کافی کتابیں موجود ہیں کہ تھوڑی سی زحمت میں متعدد کتابیں اور لغتیں ڈائرکٹر صاحب ملاحظہ فرماسکتے تھے اور سمجھ سکتے تھے کہ اردو ہندی کا جھگڑا محض چند تنگ نظر اور رجعت پسند لوگوں تک محدود ہے - ورنہ حقیقت یہ ہے کہ « ہندستانی » اس زبان کو کہتے ہیں جو شمالی ہندستان کے شہروں اور قصبوں کی عام زبان ہے اور ہزار سال سے بنتے سنورتے اس درجہ تک پہنچی ہے کہ گھر گھر بولی جاتی ہے اور جنوبی ہندستان میں بھی سمجھی جاتی ہے - اگر یہ سوال کیا جائے کہ پھر ہندی کسے کہتے ہیں، تو اس کا جواب بہت آسان ہے - یعنی اگرچہ ہندستان کی ہر بولی ہندی ہے، کوئی مشرقی (بنگالی ، اڑیہ ، آسامی) کوئی مغربی (برج ، پنجابی ، پشتو ، سندھی) اور کوئی جنوبی (تامل ، تلنگی ، کنڑی ، ملایلم) - لیکن عرف عام میں اب ہندی بولیاں

دو ہی تسلیم کی جاتی ہیں - ایک برج بھاکھا جو سری کرشن جی کی سر زمین اور مہابھارت کی یاد دلاتی ہے اور دوسری اودھی جو رام چندر جی کی راجدھانی اجودھیا اور رامائن کی یادگار ہے - ان دونوں سر زمینوں میں جو بولیاں رائج ہیں وہ واقعۃً ہندو مذہب کے نقطۂ نظر سے بہت مقدس ہیں - لیکن ان میں کوئی لٹریچر نہیں ہے - اور دیہات کی ابتدائی اور معمولی ضروریات کے علاوہ کوئی ادبی یا تجارتی کام ان سے نہیں لیا جا سکتا - اس بولی کو جہاں بھی تمدنی ضروریات سے واسطہ پڑتا ہے یہ اردو ہوجاتی ہے -

اس کے علاوہ جس طرح دوسری ہندیوں کا لٹریچر اور شاعری صرف سنسکرت کے ...سان اور عروض تک محدود ہے اسی طرح برج اور اودھی بھی ایک تنگ اور مختصر ...ائرے میں عرصے تک رہنے کے بعد مردہ ہورہی ہیں - اس پر ستم یہ ہورہا ہے کہ بجائے اس کے کہ ان کو فطری طریقہ پر ترقی کرنے کا موقع دیا جائے ان ہندی بولیوں کے دوست نما دشمن پھر اس کی گرامر کو پانی نی کےویاکرن میں جکڑنا چاہتے ہیں اور فارسی کی پرکیف اور روح پرور نغمہ سنجیوں تک پہنچنے کا راستہ روکے کھڑے ہیں -

بعض کم علم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ فارسی مسلمانوں کی زبان ہے، حالانکہ وہ بھی اتنی ہی ہندی ہے جتنی سنسکرت سے نکلی ہوئی کوئی پراکرت ہوسکتی ہے - ہندستان کی زبانوں سے اس کا اتنا قریبی تعلق ہے کہ خود سنسکرت کا بھی باقی نہیں - مختلف ہندیوں اور بنگالی کی طرح فارسی میں تذکیر و تانیث کا جھگڑا نہیں ہے - لیکن سنسکرت میں ایک حد تک اور برج اور اودھی میں تو انتہائی طور پر یہ چیز موجود ہے - پھر اضافت کا جو طریقہ فارسی میں ہے وہی بنگالی برج اور اودھی میں ہے - سب پر طرہ یہ کہ افعال اور افعال میں مخصوص طور پر مضارع ، جیسا فارسی میں ہے ویسا ہی ہندستان کی ہر مشرقی اور مغربی ہندی میں موجود ہے - مثلاً طرز تحریر کو چھوڑکر اگر ہم صرف طرز ادا پر نظر ڈالیں تو یہ واضح ہوجاتا ہے کہ فارسی میں آید کو (آئے)، رود کو (روے)، خورد کو (خورے) کہتے ہیں اور یہ آج سے نہیں ہزار سال پہلے سے رائج ہے - بابا طاہر عریان کی رباعیات پنجاب سے شائع ہوچکی ہیں اور

اسی طرح لکھی گئی ھیں جس طرح شاعر انھیں بولتا تھا ۔ ملاحظه ھو :

دلے عوشق بسوئے چوب تر بے سرے سوز سرے خونںا بے ریزے

(دل عاشق بسان چوب تر به (باشد) سرے سوزد سرے خونںا به ریزد) ۔

اب جو ناقص العلم ارتجاعی یه چاھتے ھیں که الٹی گنگا بہائیں اور ھندستانی زبان کی گرامر بھی بدل دیں تو آئیں اور سب سے پہلے مضارع پر ھاتھ صاف کرنے کی کوشش کریں تا که نتیجه یه ھو که حال و مستقبل دونوں برباد ھوجائیں ۔

بہر حال زیر نظر لغت میں یه کوشش کی گئی ھے که ایک ایسی زبان تصنیف کی جائے جو ھندستان میں کہیں بولی نہین جاتی ۔ یه نه ھندی ھے نه اردو، نه وہ عام زبان ھے جسے ھندستانی کہتے ھیں ۔ اس میں مسلسل یه کوشش نمایاں ھے که ھندستانی زبان کے روزمرہ کے عام اور رائج لفظوں کو ترک کیا جائے اور ایسے سنسکرت لفظ لائے جائیں جو خود بنارسی ھندی تصنیف کرنے والے بھی نہیں بولنا چاھتے ۔ جہاں تک ھندستانی زبان کے محاورات کا تعلق ھے وہ بھی عجیب و غریب ھیں ۔

ترجمه سے یه بھی معلوم ھوتا ھے که جنوبی ھندستان کے کسی صاحب نے ترجمه میں مدد دی ھے جن کا پیشه غالباً وکالت ھے یا وکیلوں کی بہت زیادہ صحبت رھتی ھے اس لیے که انھوں نے جن لفظوں کو سب قومی (International) تسلیم کیا ھے وہ یورپ کے اعتبار سے بھی 'سب قومی' نہیں چه جائیکه ھندستان میں وہ سب کی سمجھ میں آجائیں ۔ اس کا ثبوت یه ھے که انھوں نے BAR کا ترجمه "قانون والی سبھا" کیا ھے ۔ لیکن حاشا یه لفظ یورپ میں اب اتنا ھی عام اور سب قومی ھے جتنا خیام و غالب کے زمانے میں تو کیا آج کل بھی ھندستان کے زندہ دلوں کی زبان پر یه شعر جاری کردیتا ھے :

لاله ساغر گیر و نرگس مست و بر ما نام فسق
داوری خواھم، مگر یا رب کرا داور کنم!

پھر ایک اور چیز دکن کی یاد دلاتی ھے، لفظوں کا تلفظ بھی وھی ھے جو وھاں رائج ھے ۔ مثلاً وھاں بیرسٹر کو بیارسٹر یا کیمیرا کو کیامرا، بیگ کو بیاگ لکھتے ھیں ۔

غلطیوں سے تو ہمیں زیادہ اختلاف نہیں، ہر شخص کو اختیار ہے جو چاہے تصنیف کرے اور تاریخ ادبیات میں ایک نئے صنف سخن کے بانی کی حیثیت سے جگہ بنالے، لیکن اس کے کیا معنی کہ جو محاورے مستقل طور پر اپنی جگہ بناچکے ہیں اور بہ‌ظاہر متضاد و معکوس معنوں پر حاوی معلوم ہوتے ہیں ان کی ضد میں آپ ایک نیا محاذ قائم کریں۔ لوگ نارنگی کو «رنگی» اور گاڑی کو «چلتی» کبھی نہ کہیں‌گے، خواہ ان کا لغوی مفہوم کتنا ہی معکوس ہو اور میاں کبیر داس کتنا ہی روئیں !:

رنگی کو نارنگی کہیں — بنے دودھ کو کھویا
چلتی کو گاڑی کہیں — یہ دیکھ کبیرا رویا

آپ فرماتے ہیں کہ آنکھ ڈالنا یا آنکھ مارنا محبت کی نظر کو کہتے ہیں۔ اسی طرح کھنچنا بہ‌معنی محبت و کشش بتاتے ہیں۔ ذرا غور تو کیجیے کہ آخر کوئی کیوں بک گیا:

کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

بنیادی انگریزی کے رائج کرنے والوں کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ نہ صرف انڈوایرین بلکہ ہزاروں سامی لفظ مشرق سے مغرب تک کا سفر کرچکے ہیں۔ گرد راہ نے بعض کے خط و خال بالکل بدل دیے ہیں اور بعض اب تک اسی طرح قائم ہیں۔ جو لوگ لسانیات کی صوتی تبدیلیوں سے ذرا بھی واقف ہیں وہ نیچے لکھے ہوئے لفظوں کی اصلی صورت فورا پہچان لیں‌گے اور ہندستانی زبان کی وسعت اور ہمہ گیری کی زبان حال سے داد دینے لگیں‌گے۔ کاش ترجمہ کرنے والوں نے ہندستانی زبان کا یہ پہلو نظر انداز نہ کیا ہوتا !

ہندستانی				انگریزی
ابجد	—	—	—	ABCD
ہوز	HVZ	***	***	EFG
حطی	HTY	***	H*Y	H*J
کلمن	****	****	****	KLMN
ف	V	F	B	P
قرشت	****	****	****	QRST

انگریزی				ہندستانی
X	*	*	KSH	خص
ABLE	AABLE	QABEL	QABIL	قابل
ARCH	ARC	ARG	ARGG	ارگ
BABY	***	***	BABA	بابا
BAD	***	***	***	بد
BAND	***	***	***	بند
BASIN	*	*	BASAN	باسن
BE	B	BUDAN	BOODAN	بودن
BERRY	*	*	*	بیری
BIRD	PARD	*	PARIND	پرند
BODY	*	BADAN	*	بدن
BROTHER	*	(BHARATA)	*	برادر
By	*	*	BA..BE	به
CHALK	***	***	KHAAK	خاک
CHEMISTRY	*	AL-CHEMY	**	کیمیا
COME	C..OME	OME	OMAD	آمدن
COMMON	C..OMM	OME	AAM	عام
COTTON	*	*	*	قطن
COUGH	*	KAF	*	کف
CREDIT	CRED	QARAD	*	قرضه
CRIME	JRIME	JARAIM	(JURM)	جرم
CRY	QARA..A	**	(QARA..A)	قرأت
CUT	KAT	QAT		قطع ـ کٹنا
DARK	DAREK	TAREK	TAREEK	تاریک
DAUGHTER	DOCHTAR	DUKHTAR	*	دختر

انگریزی				هندستانی
DEEP	DWEEP	DO..AAB	DO AAB	دوآب
DEGREE	DIJREE	DER JA	DAR JAH	درجه
DIS..COVER	COVER	KOFER	KAFAR	کفر
BITTER	PITTER	PITTA	PIT	پت
BOIL	BUBULA	*	U..BAAL	ابال
BONE	*	*	BONG	بونگ
BRAIN	PRAIN	PRAAN	*	پران
CARRIAGE / CART / CAR		GARRI	GARII	گاڑی
CRACK	*	*	TARAQ	ترقنا

انگریزی	هندستانی	انگریزی	هندستانی	انگریزی	هندستانی
Danger	ڈر	Door	در - دوار	Earth	ارض
Eye	عین - آنکھ	Father	پدر - پتا	Far	پار - پرے
Feather	پر	Finger	انگل	Flower	پھول
Fiction	فسانہ	Foot	پد	Full	پُر - پورا
Go	گیا (جانا)	Grain	غلّه	Grass	گھاس
Grip	گرفت	Group	گروه	Guide	قائد
(H) . Hand	هاتھ	Had	هتھا - تھا	Heart	هردے
Here	یہاں	(I) Ice	یخ	In, Enter	اندر
Judge	جانچ	(K). Key	کنجی	Knot	گانٹھ
Jewel	جواهر	Knowledge	گیان	(L) Look	لکھنا (پوربی)
Laugh	لاف	Lip	لب	Love	لوبھ
Matter / Material / Metal	مادّه	Man	منش - مانس	Meat	ماس
Middle	منجھ - مدھے	Mother	ماتا - مادر	Mind	من
Mouth	منھ	Month	ماه	Mister	مرزا

ہندستانی	انگریزی	ہندستانی	انگریزی	ہندستانی	انگریزی
نہ - نہیں	No, Not	نارنج	Orange	ناتھ (نا)	Net
بر - اوپر	Over	پاپڑ	Paper	پیڑ	Pain
فرد - پرت	Part	پانا	Pay	پاستان	Past
پرش	Person	با-ران	-rain	بوند	Point
رسید	Receipt	ارز	Rice	راحت	Rest
راست	Right	رم (کردن)	Run	راہ	Road
زند	Sand	شخص	Sex	نشست	-seat
شرم	Shame	کرتا	S-kirt	چھوٹا	Short
ایسا	So	ستارہ	Star	صاف (کنندہ)	Soap
شکر	Sugar	صراط	Street	صوت	Sound
طال - طول	Tall	سپرلٹی (پشتو)	Spring	?(زمٹی' زمستان)	Summer
آواز	Voice	ترکیب	Trick	تو - تب	Then
نام	Name	جوان	Young	بول	Word

یہ تو صرف سطحی طور پر انگریزی کے چند صد لفظوں کا ہندستانی سے تقابل تھا۔ اگر پوری انگریزی لغت پر نظر ڈالی جائے تو معلوم نہیں کیا کیا انکشاف ہوں۔

اب ہم ذیل میں اس لغت کے صرف حرف الف (A) پر نظر ڈالتے ہیں اور جو ترجمے مترجم صاحب نے دیے ہیں ان کے لیے ہندستانی زبان کے محاوروں کے مطابق ترجمے درج کرتے ہیں۔

انگریزی	ترجمہ	تصحیح
A	ایک	کوئی - ذرا
A	....	ایک - کچھ
Give it a pull	اسے کھینچو	ذرا اسے کھینچو
ABLE	اچھا	قابل
enough	بس	کافی

انگریزی	ترجمہ	تصحیح
be right ABOUT the facts	ٹھیک واقعے جاننا	واقعات کے متعلق صحیح معلومات رکھنا
goods ON ACCOUNT	حساب میں مال	سامان قرض لینا اور بہ اقساط ادا کرنا
ACID look	تیز نظر	غصہ کی نظر، تیکھی چتون
Material	چیز	مادّہ
ADDITION	جوڑ ۔ بڑھانا	میل ۔ اضافہ
in addition to this	اس کے سوا	اس کے ساتھ ساتھ
ADVERTISEMENT	(وگیاپن)	(پرچار)
go AFTER a rat	چوھے کے پیچھے جانا	چوھے کا پیچھا کرنا
AFTER ALL they were young.	پھر بھی وہ بچے تھے	آخر وہ بچے ھی تو تھے
AFTER-taste	پیچھے کا مزہ	(اثر)
AGAINST	(وردھ)	خلاف ۔ مقابلہ میں
fighting AGAINST an army.	فوج کے خلاف لڑنا	ایک پوری فوج سے لڑنا
AGREEMENT	میل ۔ سمجھوتا	اتفاق ۔ معاھدہ
come to an AGREE MENT.	سمجھوتا کرلینا	آپس میں طے کرلینا
A year	برس کو	سالانہ
un-Able	اچھا نہیں	ناقابل
trees	جھاڑ	درخت ۔ پیڑ
ABOUT history	تاریخ پر کتاب	تاریخ کی کتاب
looking ABOUT for a place.	جگہ دیکھنا	جگہ تلاش کرنا
ACID	تیزاب ۔ تیز	ترش ۔ کھٹا (بھی)

انگریزی	ترجمہ	تصحیح
ACROSS	پار	آر پار
ACT	(کریا)	(کرم)
a good ADDITION	اچھی چیز بڑھانا	ایک اچھا اضافہ
bad at ADDITION	جمع کرنے میں خراب	جمع کرنے میں کمزور
ADJUSTMENT	ٹھیک لگانا - برابر کرنا	ٹھیک کرنا - درست کرنا
Public attention.	اشتہار	عام توجہ
a picture AFTER Rambrandt.	رامبران کی کاپی	ایسی تصویر جس میں رامبران کی پیروی کی گئی ہو -
AFTER-thought	بعد کا خیال	بعد کی توجیہ
resting AGAINST the wall.	دیوار سے لگی ہوئی	دیوار کے سہارے
be AGAINST change.	بدلنے کے خلاف ہونا	تبدیلی کے....
be in AGREEMENT with	ساتھ ہونا	اتفاق کرنا
AIRED	ہوا کرنا	ہوا دکھانا
(a) behaviour	چال	چلن
foolish AIRS	بے سمجھی کی چال	اِترانا
All	سب	سب - کُل
At ALL times	سدا	ہمیشہ
All in black	پورا کالا	کل سیاہ رنگ میں
All right	بالکل ٹھیک	درست - اچھا
for ALL that	ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے	باوجود ان کے
ALMOST a man	قریب قریب آدمی	تقریباً جوان

انگریزی	ترجمہ	تصحیح
AMONG books	کتابوں میں ہونا	کتابیں پڑھتے ہوئے ہونا
make a division among	میں تقسیم کرنا	میں فرق (امتیاز) کرنا
AMOUNT	روپیہ - مقدار (پریمان)	رقم
AMUSEMENT	دلگی - مزہ (بڑے مزے کی شب وصل دلگی ہوگی)	تفریح - لطف
AND so on	اور اسی طرح	علی ہذاالقیاس
AND saw him	اور اسے دیکھا	اور اس سے ملا
looking at picture fr-om different ANGLE	تصویر کو دوسرے خیال سے دیکھنا	تصویر کو دوسرے زاویہ سے دیکھنا
ANGRY	غصہ (کرودھ)	ناراض - خفا
ALL ANIMALS but man (s)	جانور	انسان کے علاوہ سب حیوان
ANSWERING to an account.	بیان کے جیسا ہونا	حلیہ یا تفصیل کے مطابق ہونا
ANYWHERE	کسی جگہ - کبھی بھی	کہیں - کہیں بھی
an APPARATUS, tax-control	ٹیکس کا آلہ	ٹیکس پر قابو رکھنے کا آلہ
cat is ARCHING its back	بلی اپنی پیٹھ کمان کیے ہوئے ہے	بلی اپنی پیٹھ اٹھائے (ابھارے) ہوئے ہے
AIR of interst	دلچسپی کی صورت	دلچسپی کا انداز
AIR-cushion	ہوا گدا	ہوائی گدی
All the day	پورا دن	دن بھر
All is quiet	ہر چیز چپ ہے	بالکل خاموشی ہے
All but one are bad.	ایک کے سوا باقی سب خراب ہیں	سوائے خدا کے سب گنہگار ہیں
AFTER-all	پھر بھی	بہرحال

انگریزی	ترجمہ	تصحیح
All the same	پھر بھی	یکساں۔ باوجودیکہ۔ تاہم
AMMONIA	امونیا (سب قومی)	نوشادر
AMONG one's friends	دوستوں میں ہونا	دوستوں کی صحبت میں
we have 5 s. AMONG us.	ہمارے بیچ میں ۵ شلنگ ہیں	ہم سب کے پاس ملاکر ۵ شلنگ ہیں
no AMOUNT of interst will be of any use.	کتنی بھی دلچسپی کام کی نہ ہوگی	کتنی ہی دلچسپی ہو سب بےکار ہے
AMUSEMENT of Public.	پبلک کا مزہ (دلگی)	پبلک کی دلبستگی(تفریح)
AND then he said	اور تب اس نے کہا	پھر بولا
POINT of view	خیال	زاویہ نظر
Right angles	سیدھا کونا	کھڑا زاویہ
ANIMALS	جانور	جاندار ۔ حیوان
ANSWERING a bell	گھنٹی کا جواب دینا	بلانے کی گھنٹی سن کر ملازم کا جواب دینا
He is not ANY wiser	اس کو کچھ سمجھ نہیں آئی	اسے کوئی تجربہ حاصل نہ ہوا
APPRATUS	(ینتر)	(جنتر)
ARCHER	(کمانی)	تیرانداز
ARGUMENT	بحث	دلیل
a good ARGUMENT	ایک اچھا سبب	ایک عمدہ دلیل
with open ARMS	بازو پھیلائے ہوئے	خندہ پیشانی سے
an ARMY of boys	لڑکوں کی ایک فوج	لڑکوں کا گروہ

انگریزی	ترجمہ	تصحیح
looked on AS a man	آدمی سمجھ کر	اگر بحیثیت انسان کے دیکھا جائے
it SEEMS	ایسا دکھائی دیتا ھے	ایسا معلوم ھوتا ھے
AS if	جیسے کہ	گویا کہ
AT	میں	پر
AT his request	اس کی مانگ پر	اس کی طلب پر
AT night	رات میں	رات کو
they were BAD AT (Languages)	وہ زبان میں خراب تھے	زبانوں کے سیکھنے میں وہ کمزور تھے
,, ,, GOOD AT ,,	" " " اچھے تھے	" " " اچھے تھے
,, ,, QUICK AT ,,	" " " تیز تھے	" " " تیز تھے
,, ,, SLOW AT ,,	" " " سست تھے	" " " سست تھے
,, ,, EXPERT AT ,,	" " " استاد تھے	وہ زبانوں کے ماھر تھے
,, ,, WORKING AT ,,	وہ زبان پر کام کررھے تھے	وہ زبانوں کی تحقیق کررھے تھے
AT a run	ایک بھاگ میں	ایک دوڑ میں
AT pleasure	جب خوشی ھو	جب جی چاھے
a new line of ATTACK	حملہ کی نئی چال	حملہ کی نئی ترتیب
wounded in the ATTEMPT	کوشش میں زخم آگیا	کوشش کے دوران میں زخمی ھوگیا
Attraction	کھنچاؤ (کھینچنا) ..	کشش
their ATTRACTION to one another	ان کا ایک دوسرے سے کھنچاؤ	ایک دوسرے سے (محبت) و کشش

انگریزی	ترجمہ	تصحیح
Higher Authority	بڑے حاکم	حاکم بالا (اعلیٰ)
AUTOMATIC	سب قومی - آپ چالو	خود رو
WIDE-AWAKE	بہت جاگا ہوا	چوکنّا
his ARGUMENT was	اس کی بحث یہ تھی	اس کی دلیل یہ تھی
nation in ARMS	ہتیار سے تیار قوم	قوم جو لڑائی کے لیے تیار ہو
ART	کُن - کام (ویدھی)	فن - ہنر (کُن) سلیقہ
AS an example	جیساکہ	مثلاً - جیسے
so as to	اس لیے کہ	تاکہ
ASBESTOS	(سب قومی) ؟	(کوئی دھات ہے)
AT 4	چار پر	چار بجے
AT war	لڑائی پر	جنگ میں
At times	کسی کسی وقت	کبھی کبھی
knowledge at first hand	پہلے آدمی سے علم	تازہ معلومات
have a GO AT	کوئی کام کرنا	حملہ کرنا
3 AT a time	ایک وقت میں تین	ایک ہی دفعہ میں تین تین
get AT details	تفصیل کا کھوج لگانا	تفصیلات تک پہنچنا
AT tables	میزوں پر	دسترخوان پر کھانے کی حالت میں
AT sea	سمندر میں........	حیرت و تعجب میں ہونا
make EYES AT	آنکھ ڈالنا - آنکھ مارنا	محبت سے دیکھنا
ATTEMPT	(پریتن)	(پرجتن)

انگریزی	ترجمہ	تصحیح
Attention	خیال	توجہ
She has no ATTRACTION off the stage .	اسٹیج سے باہر اس میں کوئی کھنچاؤ نہیں	اسٹیج سے باہر اس میں کوئی کشش نہیں
Authority	استاد ۔ حاکم	ماہر ۔ بااختیار
an AUTHORITY on the Great War.	بڑی لڑائی کا استاد (یا) بڑی لڑالی پر سند	جنگ عظیم کا عالم
Awake	جاگا ہوا	بیدار، جاگتا ہوا، جاگتا

اب تک ہم نے صرف حرف (A) کی جدول پر نظر ڈالی ہے ۔ پوری کتاب کو (Z) تک درست کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ ایک نئی کتاب لکھ دی جائے ' جو نہ تو ضروری ہے ' نہ اس رسالے میں اس کی گنجائش ہوسکتی ہے ۔ لیکن قارئین " اردو " پر ظلم ہوگا اگر صرف خشک علمی مباحث ہی ہمیشہ پیش کیے جائیں اور وہ ان مطائبات سے محروم رہ جائیں جو غالباً غیر ارادی طور پر اس لغت میں پیدا ہوگئے ہیں ۔

یہ چیزیں کچھ زیادہ عجیب نہیں ہیں ۔ عام رواج کے خلاف یا فطری اصولوں کے " وِرُدھ " جب کبھی کوئی ادبی کوشش کی جاتی ہے تو نہ جانے کیوں ہمارے اعصاب پر ایک خاص اثر پڑتا ہے ۔ اگر یہ اثر اس انداز سے پڑے کہ دماغ میں پے در پے مخصوص لہریں پیدا ہونے لگیں تو اکثر آنتوں میں بل پڑجاتے ہیں اور حلق سے عجیب غریب آوازیں پیدا ہونے لگتی ہیں ۔ یہ اعصابی مظاہرہ جس میں دل و دماغ کا بھی اشتراک ہوتا ہے صرف انسانوں تک محدود ہے جس کی وجہ سے عہد حاضر کے ماہرین نفسیات نے ارسطو کی قدیم تعریف کو مسترد کردیا ہے اور انسان و حیوان میں تمیز کرنے والی چیز " عقل " نہیں بلکہ صرف " ہنسی " کو قرار دیا ہے ۔ آپ خود غور فرمائیں تو معلوم ہوجائے گا کہ جانور اکثر روتے ہوئے پائے گئے ہیں ' لیکن ہنسنے والا جانور سوائے انسان کے اب تک کوئی نہیں ملا ۔

شاعر کپلنگ (Kipling) نے بنگالیوں کی انگریزی کو بابو انگلش کا نام دیا تھا ۔ یہ انگریزی زبان کی ادبیات میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے ۔ اس نے جو جو کاوشیں اس صنف زبان کو سمجھانے میں کی ہیں وہ قابل داد ہیں اور عرصہ ہوا کتابی صورت میں شائع بھی ہوچکی ہیں ۔ یہ کتاب آپ کی دسترس سے باہر ہو تو رابنسن کروسو (Robinson Crusoe) میں فرائی ڈے کی زبان پڑھ لیجیے لیکن اگر آپ یہ زحمتیں نہیں اٹھانا چاہتے تو مندرجہ ذیل الفاظ اور جملوں ہی سے لطف اٹھائیے اور کبھی کبھی اس زبان میں بولنے اور ترجمہ کرنے کی بھی کوشش کیجیے ۔ یہ خیال رہے کہ یہ ڈکشنری زیادہ تر آپ کو ترجمہ کرنے میں مدد دینے کے لیے تیار کی گئی ہے ۔ لفظی ترجمہ کی وہ صنف اس جدید کوشش سے بالکل الگ شے ہے جسے اب ہم گلابی اردو سے موسوم کرتے ہیں ۔ نہ یہ اس قسم کا بالکل لفظی ترجمہ ہے جو کبھی کبھی اسکولوں کے شریر لڑکے تفریحاً کرتے رہتے ہیں ۔ مثلاً کمبل کا ترجمہ (کم = تھوڑا = Less) ' (بل = طاقت = Power) Less - power ۔ " چکر کھانے " کا ترجمہ Eating Circles ۔ یا " لا لا دل سکھ رائے چاندنی چوک میں مرگئے " کا ترجمہ :- Bring bring Heart-Comfort-Opinion Moonlight-square in die went .

بلکہ نیچے لکھے ہوئے ترجمے اس ہندستانی زبان کا نمونہ ہیں جو بقول مترجم " ہندستان کے اُتر میں " (یعنی نیپال ' تبت ' چین وغیرہ میں) " عام میل جول اور بات چیت کا ذریعہ ...... ہے " اس لیے ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیے اگر ان ملکوں کے لوگ اتنی بھی ہندستانی بول لیتے ہیں ۔ (دیکھیے " بیسک ہندستانی " پہلی کتاب ۔ پہلی سطر " مطبوعہ ٹائمز آف انڈیا پریس ۔ بمبئی)۔ بہر حال ہم چند نمونے درج ذیل کرتے ہیں ۔ افسوس ہے کہ ہم پوری کتاب پر تنقید کی ضرورت محسوس نہیں کرتے ۔ صرف ساٹھ صفحوں تک سرسری نظر میں جو کچھ مل گیا ہے وہ آپ کی ضیافت طبع کے لیے حاضر ہے :-

(نوٹ) شروع سطر میں جو عدد دیا گیا ہے وہ اس صفحہ کا نشان ہے جس میں یہ لفظ یا فقرہ مل سکتا ہے :-

کیا ترجمہ کیا گیا ہے	کیا ہونا چاہیے
(۱۷) بچے کو روگ ہے	بچہ بیمار ہے
بچہ کی گاڑی	چھوٹی گاڑی
کتاب کی پیٹھ	کتاب کی پشت
پھر روپیہ لے لینا	روپیہ واپس پانا
پیچھے کی جگہ	دُم ۔ پچھلا حصہ ۔ بعد والا
پیچھے کا دروازہ	خفیہ طریقے ۔ پوشیدہ ترکیبیں
پھر آنا	واپس آنا ۔ لوٹ آنا
پیچھے سے آواز دینا (یا نکالنا)	آواز کو اصلی حالت پر واپس لانا یا آواز کے جواب میں آواز دینا
(۱۸) بہت برا قرضہ	ایسا قرضہ جس کے واپس ملنے کی امید نہ ہو
ایک خراب کتاب	ایک بری کتاب
کل دودھ خراب ہوجائے گا	کل دودھ کھانے کے قابل نہ رہے گا
پینے کے سبب سے اور بھی خراب	پینے کے لیے تو اور بھی برا
زبان میں خراب	جو شخص زبانیں سیکھنے میں دقت محسوس کرے (یا) زبانیں سیکھنے میں ہیٹا
بیاگ پائپ	بیگ پائپ یا بین
وزن ۔ کانٹا	ترازو ۔ کانٹا
(۱۹) خیال برابر نہ رکھنا	اپنا توازن کھودینا
لڑکی کے پاس ایک گولا ہے	لڑکی کے پاس گیند ہے
بار ۔ قانون والوں کی سبھا	میخانہ ۔ بھٹی ۔ (بار)

کیا ترجمہ کیا گیا ہے	کیا ہونا چاہیے
(۲۰) نہانے کی جگہ	حمام - غسلخانہ
(۲۱) یا یہ کہو	یعنی
سندر - (نہ سندر)	حسن - (قبح) خوبصورت - بدصورت
اپنے قاعدے کے سبب سے اچھا	اپنے قواعد کے اعتبار سے بہترین
(۲۲) ندی کی تہہ گہری ہے	دریا گہرا ہے
جج کے آگے	جج کے سامنے - جج کے روبرو
(۲۳) ان کے عجیب عجیب ایمان تھے	ان کے عجیب عجیب عقیدے تھے
(۲۴) واقعے کے بیچ کا وقت	واقعات کے درمیان کا زمانہ (وقفہ)
چڑیا نظری (Bird's eye view)	سرسری نظر - عام نظر
(۲۵) جنم جگہ (Birth place)	جائے ولادت - پیدائش کی جگہ - جنم بھوم
جنم نمبر (Birth rate)	تعداد پیدائش
جنم حق	پیدائشی حق
(۲۶) کاٹ سے زخم	دانت مارنے کا زخم
کالی چڑیا	کوئل
دھات کی کالی پالش	جستۂ سیاہ (جو پنسلوں میں ہوتا ہے)
(۲۷) رکت	لہو (خون)
(۲۸) مرا ہوا	مردہ - نعش - لاش
اچھا بدن رکھنا	تندرست بدن
(۲۹) جگہ لینا	(ریل یا کسی اور جگہ کے) ٹکٹ خرید کر نشستوں کو محفوظ کرنا
(۳۰) اس کے بالکل بھیجا (دماغ) نہیں ہے	وہ ذرا بھی عقل نہیں رکھتا
(۳۱) روٹی اور مکھن	دال بھات
سانس ٹوٹ جانا	سانس پھول جانا (چڑھ جانا) بیدم ہوجانا

کیا ترجمہ کیا گیا ہے	کیا ہونا چاہیے
(۳۲) برابر نہ سونا	اچٹی ہوئی نیند
یہ آدمی ناس ہوگیا	وہ آدمی برباد ہوگیا
روٹی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی	روٹی سڑگئی
(۳۳) بہن کا مرد	بہنوئی - برادر نسبتی
اپنے بالوں میں برش کرنا	اپنے بالوں میں کنگھی کرنا (سنوارنا)
(۳۴) غصہ کرنا	خفگی کی شدت - غصے کا زور
بجلی کا گولا	بلب (Bulb) - بجلی بتی
(۳۵) تمھیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے	تم سے مطلب! تمھارا اجارہ! تم ہونے کون ہو!
آدمیوں کے دماغ نہ ہو تو وہ جانور جیسے ہیں	انسان بھی حیوان ہے دونوں میں فرق یہ ہے کہ انسان کے عقل ہوتی ہے
(۳۶) چھاچھ	خالص دودھ (جس سے مکھن نہ نکالا گیا ہو)
انشورنس ہونے سے	بیمے (انشورنس) کی وجہ سے محفوظ
(۳۷) کل آجاؤ	کل تک آجاؤ
(۳۸) کافی خانہ - کیلنڈر	قہوہ خانہ - جنتری
(۳۹) کرایہ پہلے دے کر بکس بھیجو (Carriage forward)	پیشگی کرایہ نہ دے کر بکس بھیجو (محصول طلب)
پہلا سبب	خالق - پروردگار
(۴۰) ڈوور کی چاکی پہاڑی	ڈوور کی خاکی (یا کھریا مٹی کی) چٹانیں
(۴۱) پیسے	ریزگاری
(۴۲) بڑا (Chief)	سردار - چیف
(۴۳) چرچ ایک انتظام ہے	'چرچ' مذہبی گروہ بندی کے نظام کا بھی نام ہے
چرچ میں نوکر ہونا	پادری بن جانا

کیا ترجمہ کیا گیا ہے	کیا ہونا چاہیے
کام کے بعد بالکل صاف کر دینا	کام کے بعد چیزوں کو درست کرنا
(۴۴) الگ رہنا	بچ نکلنا
(۴۵) رنگ کا نیا کوٹ کاکٹیل - کوناک (؟ ؟)	کسی چیز پر نیا رنگ پھیرنا (شراب کی قسمیں)
(۴۶) ٹھنڈ ہونا	زکام ہوجانا
(۴۷) یہ میری آس کے برابر آتا ہے	یہ میری امیدوں کے مطابق ہے
(۴۸) میرا لڑکا مجھے سکھ دیتا ہے	میرا لڑکا میری راحت کا باعث ہے
(۴۹) وہ جلسوں میں ساتھی کے لیے جاتی تھی	وہ جلسوں میں اس لیے جاتی تھی کہ وہاں لطف صحبت حاصل ہوتا تھا
(۵۰) پیچ والے خیال کا آدمی	سنکی آدمی - خبطی
(۵۱) جاننا	ہوشیار ہونا
(۵۲) کھانا اچھا ہے	کھانا اچھا پکا ہے
(۵۳) دیس میں کھیت	دیہات کا کھیت
(۵۴) آڑ میں ہوجاؤ	(فوجی اصطلاح) کسی چیز کی آڑ لینا
(۵۵) ساکھ پر	قرض دینا (جس میں باقساط روپیہ ادا ہو)
(۵۶) چالو - دھار	رائج - رواں - لہر
(۵۷) روٹی کاٹی گئی	روٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے
(۵۸) بیٹے کی عورت (استری)	بہو - (یعنی پوت کی جورو !)
(۵۹) میرا پاؤں سوکھ گیا ہے	میرا پاؤں سن ہوگیا ہے
(۶۰) اس کی آس کی موت	اس کی امیدوں کی پامالی (پر پانی پھرجانا)

تفریح کی ایک حد ہوتی ہے - غالباً ساٹھ صفحوں کی اس ادبی داستان سننے کے بعد آپ کو یہ معلوم کرنے کی خواہش نہ ہوگی کہ اس افسانے کا انجام کیا ہوا -

بنیادی انگریزی جیتی - یا بنیادی ہندستانی ؟ یا دونوں ہندستان کے اثر میں رائج ہوگئیں ؟ ! ... (م-ا-خ)

نظم اردو

مصنفہ جناب سید ابوالعلا حکیم ناطق لکھنوی - تقطیع ۲۰×۳۰/۸ - صفحات ۱۲۰+۴۵ - قیمت دو روپیے - ناشر: مصنف ۱۶ کنٹونمنٹ روڈ، لکھنؤ -

کتاب کے شروع میں بہت سے مشاہیر ادیبوں کی رائیں، کشفی صاحب کی تحریر بہ طور تعارف، پیش لفظ اور مصنف کا دیباچہ ہیں - ناطق صاحب خود ملک کے مشہور ادیبوں میں سے ہیں - یہ تحریریں اس مہتم بالشان تصنیف کی وقعت کا اعتراف ہیں -

ناطق صاحب نے یہ کتاب لکھ کر ملک کے ادب پر بہت بڑا احسان کیا ہے - اصل کتاب مسدس کی صنف میں ہے اور قریباً ہر بند پر اور کہیں کہیں ہر مصرع کے موضوع پر مفصل حاشیہ ہے - یہ حاشیہ بہ جائے خود ایک علیحدہ کتاب کا حکم رکھتا ہے جسے اردو اور اس کے متعلقات کے بارے میں واقفیت کا گراں قدر ذخیرہ کہنا چاہیے -

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اردو نظم میں مسلسل اور مربوط کلام کی گنجایش اور استعداد نہیں - زیر نظر تصنیف اس خیال کی زبردست تردید ہے - جس تسلسل اور وضاحت سے اردو کی سوانح عمری اس نظم میں بیان کی گئی ہے ہر اہل ذوق سے خراج تحسین طلب کرتی ہے - حواشی کے علاوہ جن کا ذکر ابھی آچکا ہے، اس کتاب کی ترتیب میں ایک نہایت پسندیدہ طریق برتا گیا ہے - اصل نظم کا صرف ایک بند بائیں طرف کے صفحہ پر ہے اور اسی صفحہ کے بائیں کنارے پر نمونہ کے طور پر ان شاعروں کے دو چار شعر دے دیے ہیں جن کا ذکر بند میں آیا - حواشی نے داہنی طرف کے پورے صفحہ پر قبضہ کیا ہوا ہے - گویا ایک کتاب میں تین کتابیں مشتمل ہیں -

اس پیچیدہ مسئلہ کو کہ اردو کہاں پیدا ہوئی اس طرح نبٹاتے ہیں :-

دھلوی بازار اردو میں خریدار زباں   دکھنی دربار تغلق میں گھر بار زباں
عہد محمودی سے ہے پنجاب سرکار زباں   بودھ تک پہنچے بہاری لے کے زنّار زباں

اک مورخ کیا کہے کب اور کہاں پیدا ہوئی   ملک میں تاریخ سے پہلے زباں پیدا ہوئی

(بند کے چاروں مصرعوں پر مفصل نوٹ ہیں) - آج کل ہر معاملے میں ملّی اور سیاسی پخ نکالی جاتی ہے اور اس زبان اور کلچر کی ذرا پروا نہیں کی جاتی جو ہمارے ہندو اور مسلمانوں کے بزرگوں نے صدیوں کی کوشش سے پیدا کی تھی - لوگ رواداری اور باہمی اتحاد کو معاشرت سے نادانستہ خارج کررہے ہیں - اسی ضمن میں فرماتے ہیں :-

میل میں صبح عرب سے کب تھی شام ہند کم
مختلف ہونے پہ بھی ملتے ہیں زلف و رخ بہم
دلربائی کو بتان ہند پہنچے تا حرم
ہوگئے تھے ایک مل‌کر کعبہ و بیت‌الصنم

منسلک آپس میں تھے شیخ و برہمن اس طرح
ہم بغل ہم‌دوش ہو چولی سے دامن جس طرح

(اس بند کا حاشیہ بھی ملاحظہ کے قابل ہے)- جو لوگ زبان، کلچر اور معاشرت کو علیحدہ علیحدہ سمجھتے ہیں، غلطی پر ہیں- اور اداروں کی طرح بعض حضرات مقامی اور صوبائی تفریق و امتیاز اور مرکز و غیر مرکز کے پھیر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں ناطق صاحب اس سے بالاتر معلوم ہوتے ہیں - وہ اردو میں لکھنؤ کے اجتہاد کو یا اسے جو چاہے کہیے مصحفی سے منسوب کرتے ہیں- چنانچہ لکھا ہے :-

لکھنؤ میں راہ اک نکلی نئی تسلیم کی
مصحفی نے اک نظام خاص کی تنظیم کی
ان کے شاگردوں نے جو تنسیخ یا ترمیم کی
ملک کے ہر ناظم و ناثر نے وہ تسلیم کی

صاف ہوکر اب زباں کے شعلے دلکش ہوگئے
جملہ منسوخاتِ ناسخ نذرِ آتش ہوگئے

ناطق صاحب آج کل کی زبانی جنگ زرگری سے متاثر تھے جب انھوں نے اس نظم کو ختم کیا - اور ہونا بھی چاہیے تھا - ملک کے ہر بھی خواہ کے ایسے ہی احساسات ہونے چاہییں - کہتے ہیں :

آج کل پینتیس کروڑ افراد میں اردو زباں
اس طرح ہے جس طرح بتیس دانتوں میں زباں

لیکن اگر یہ بتیس یا ان میں سے کئی دانت اس زبان کا قیمہ کرسکتے ہیں تو یاد رہے کہ وطن کا منہ زبان کے بغیر رہ‌جائے گا - وہ گونگا ہوجائے گا - ہم ناطق صاحب کو یقین دلاتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوگا - اردو کسی کے منہ کا نوالہ نہیں ہے - کوئی دن جاتا ہے کہ برادران وطن اجتماعی طور پر سیدھے راستے پر آجائیں‌گے اور فضا صاف ہوجائے گی -

آخر میں یہ کہنا ہے کہ یہ کتاب چونکہ زبان کے متعلق بے شمار واقعات اور کوایف پر حاوی ہے اس لیے کہیں سہو ہوجانا بڑی بات نہیں - جیسے صفحہ ۲۲ میں امیرخسرو کا مولد پنجاب لکھا ہے - یہ مغالطہ یوں ہوا کہ وہ پٹیالی کو جو ان کا مولد ہے پٹیالہ سمجھ‌کر پنجاب لکھ گئے - پٹیالی ضلع ایٹہ قسمت آگرہ کا ایک مشہور قصبہ ہے جس کی وضاحت قدرت‌اللہ شوق نے اپنے تذکرہ طبقات الشعرا میں کردی تھی - امیرخسرو منصبی حیثیت سے ملتان ضرور گئے تھے - اسی طرح اردو کے سب سے پہلے شعر کا معاملہ وغیرہ ہے -

شروع میں مصنف نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے جس میں اردو شاعری پر تبصرہ ہے اور اس کے بعد قدیم دکنی شعرا کے کلام سے کچھ کچھ اشعار انتخاب کے طور پر لکھے ہیں - یہ اشعار اکثر غلط نقل کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے فاضل مصنف کو جگہ جگہ یہ لکھنا پڑا ہے کہ یہ مصرع ناموزوں ہے' یہ شعر مہمل ہے' اس لفظ کے معنے سمجھ میں نہیں آئے - وجہ یہ ہے کہ فاضل مصنف نے بعض ایسے حضرات کی تالیفات کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے جو نہ تو اس زبان کو جانتے ہیں اور نہ قلمی کتابوں کو صحیح پڑھ سکتے ہیں - اس لیے غلط سلط جو سمجھ میں آیا لکھ دیا -

چوں کہ اصل تصانیف حکیم صاحب کی نظر سے نہیں گزریں اور انھوں نے دوسروں کی تالیفات پر اعتماد کیا اس لیے یہ غلطیاں واقع ہوئیں ورنہ اصل میں نہ کوئی مصرع غیر موزوں ہے اور نہ کوئی شعر مہمل ہے اور نہ کوئی لفظ ایسا ہے جو بےمعنی ہو ۔ مثال کے طور پر ہم صرف چند اشعار یہاں لکھتے ہیں کیوں کہ اس تبصرے میں اتنی گنجائش نہیں کہ سب غلط اشعار کی صحت کی جائے ۔ مناسب یہ تھا کہ جناب حکیم صاحب ساتھ ساتھ ان ماخذوں کا حوالہ بھی دے دیتے جہاں سے یہ کلام نقل کیا گیا ہے۔ کیوں کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دوسروں کی غلطی مصنف کے سر تھپ جاتی ہے ۔

ملے ہر حال آکر اجدھا دو
ہوئی دو دھرتے لٹ پٹ بلا دو (ص ۲۷)

حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ " دوسرا مصرعہ اس زمانے کے لحاظ سے بھی ناموزوں ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ لکھنے والا سمجھا نہیں ۔ یہ لفظ " دو دھر " نہیں بلکہ " دو دھیر " ہے جس کے معنے ہیں دونوں جانب ۔ اب مصرع موزوں ہوجاتا ہے ۔

" دلیری سوں دیراں ہات میں ہات
ملائے گرز اور ہور شمشیر کے سات (ص ۲۸)

بہت زیادہ ضعف نظم اور اشعار میں ہے ۔ یہاں تک کہ بےمعنی ہوگئے ہیں " ۔ یہ ضعف نظم و معنی محض لفظ دیران کی وجہ سے ہوا ۔ یہ بےمعنی لفظ ہے۔ اصل میں ہے " دیے ان " ۔ اب معنے صاف ہوگئے ۔ جن صاحب نے اصل قلمی سے نقل کیا وہ صحیح نہیں پڑھ سکے اور بےسمجھے ایک غلط لفظ لکھ دیا ۔

" زہے مجلس آرائے فن دلفریب
دیانیہ کی یوں مجالس کوں زیب " (ص ۲۸)

دلفریب فن کی صفت ہے ۔ اضافت نہیں رکھی قدیم دکنی شعرا اس کی پابندی نہیں کرتے تھے ۔ " نیہ " کے معنے دل کے نہیں ، محبت اور عشق کے ہیں ۔

" دسیں ہر ورق بیچ کے خوش چمن
ہر اک بات میں سمیں پھول بن " (ص ۲۸) ۔

حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ "مصرع اولیٰ میں کے زائد ہے' .... مصرع ثانی ناموزوں ہے"۔ شعر بہت غلط نقل کیا گیا ہے۔ یہ " کے " نہیں بلکہ " کئی " ہے اور " کئی " قدیم دکنی لہجے میں " فع " کے وزن پر ہے دوسرا مصرع یوں ہے :

" ہر یک بیت میں کئی سو ہے پھولین "

" ہر یک گرچہ مصرع اچھے یکہ نہال
دل عارفاں کرے طوبیٰ مثال " (ص ۲۹)

دوسرا مصرع ناموزوں نہیں۔ غلط نقل کیا گیا ہے۔ اصل میں یوں ہے :

ولے عارفاں کن ہے طوبیٰ مثال

اب شعر بھی بامعنی ہوگیا اور پہلے مصرع میں " اگرچہ " پر جو اعتراض تھا وہ بھی باقی نہیں رہا۔

نہیں شاخ اچھی گرچہ ہریک چمن
جمی ہیں معانی کے میویاں سوں بن (ص ۲۹)

شعر کی موجودہ صورت میں حکیم صاحب کا یہ فرمانا کہ مصرع اول بے معنی ہے اور " جمی ہیں " (دوسرے مصرع میں) کچھ جمتا نہیں " بالکل صحیح ہے۔ لیکن شعر بالکل غلط نقل کیا گیا ہے۔ صحیح شعر یوں ہے :

ننھی شاخ اچھے گرچہ ہریک بچن
خمی ہے معانی کے میویاں سوں پن (ص ۲۹)

یعنے اگرچہ ہر قول (یا مصرع) ایک ننھی سی شاخ ہے لیکن وہ معانی کے میووں سے جھکی پڑتی ہے۔

اے پنچھی پیارے سخن آغاز کر
حمد سوں حق کی بلند آواز کر (ص ۳۲)

مصرع اولیٰ ناموزوں نہیں ہے۔ قدیم دکنی تلفظ کے مطابق پنچھی میں ن غنہ ہے۔ اب پڑھیے مصرع موزوں ہوجائے گا۔

لگنے ماونے جبہ سرابان کی موج
جلے جو کدھن تب حرارت کی فوج (ص ۳۹)۔

حکیم صاحب کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے " جو کدھن کیا چیز ہے خدا معلوم " چلے بھی غلط ہے - اس میں شاعر کا کوئی قصور نہیں اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے پڑھنے والے ایسے کوڑھ مغز ہوں گے - اصل مصرع یوں ہے :

" چلی چوکدھن تب حرارت کی فوج "

چوکدھن کے معنے ہیں چاروں سمت سے -

غرض اس قسم کے اکثر شعر غلط لکھے گئے ہیں اور اس وجہ سے شعر مہمل اور بے معنی نظر آتے ہیں - اس میں فاضل مصنف نظم اردو کا کوئی قصور نہیں - وہ ماخذ ہی ناقص اور غلط ہیں جہاں سے یہ اقتباسات کیے گئے ہیں -

اسی طرح شعرا کے حالات اور تصانیف کے سنین وغیرہ میں بھی غلطیاں پائی جاتی ہیں - سلطان محمد قلی قطب شاہ کے متعلق لکھا ہے کہ اردو میں ان کا تخلص قطب اور فارسی میں معانی ہے - یہ صحیح نہیں - اردو اور فارسی دونوں میں ان کا تخلص قطب ہے - میری نظر سے ان کا اردو اور فارسی کلیات گزرا ہے ، کہیں معانی تخلص نہیں کیا - ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متعلق لکھا ہے : «خود بادشاہ اردو شعر کہنے لگا اور نثر میں ایک کتاب فن موسیقی پر نورس نامہ کے نام سے ایسی لکھی کہ ظہوری کے مقدمے نے اسے سند دوام لکھ دی» - نورس نامہ نثر میں نہیں بلکہ نظم میں ہے اور اس کی زبان بھی اردو نہیں -

افضل کے متعلق لکھا ہے « مولف شہ پارہ نے بارہ ماسہ والے افضل کو جھنجھانوی لکھا ہے اور « پنجاب میں اردو » کے مصنف نے لکھا ہے - جھنجھانہ پنجاب کا ایک قصبہ ہے » - «پنجاب میں اردو» کے مصنف نے جھنجانہ کو پنجاب کا قصبہ کہیں نہیں لکھا - معلوم نہیں حکیم صاحب کو یہ اطلاع کہاں سے ملی - وہ اس کے متعلق لکھتے ہیں « میرٹھ کے قریب جھنجانہ یا جھنجنہ ایک پرانی بستی ہے» (پنجاب میں اردو ص ۱۷۹) جھنجانہ ضلع مظفرنگر کا قصبہ ہے اور میرٹھ سے قریب ہے -

اس قسم کی بہت سی غلطیاں پائی جاتی ہیں اور اس کی زیادہ‌تر وجہ یہ ہے کہ فاضل مصنف نے جن ماخذوں سے استفادہ کیا ہے وہ قابل اعتماد نہیں -

آخر میں ہم حکیم ناطق صاحب کو ان کی وسیع تحقیقات اور اسے فصیح اور سلیس نظم کا جامہ پہنانے پر مبارک‌باد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہر اہل وطن اس تصنیف سے مستفید ہوگا۔

مذہب و اخلاق

فہم قرآن

ندوۃالمصنفین (قرول باغ، دھلی) کے علمی کاموں کا رسالہ اردو میں پہلے ذکر آچکا ہے۔ یہ اس ادارے کی چھٹی کتاب، مولوی سعید احمد صاحب ایم۔ اے کی تالیف ہے اور پاکیزہ خط میں بہت صاف ستھری چھپی ہے۔ کتاب کے ابتدائی ابواب میں فہم قرآن‌مجید کی شرائط کی بحث اور بعض جدید تعلیم یافتہ حضرات کی تردید کی گئی ہے جس میں مناظرے کا رنگ غالب ہے لیکن آگے چل‌کر تدوین حدیث اور محدثین کرام کے حالات لکھے ہیں جو کتاب کا نہایت مفید حصہ ہے اور اسے پڑھنے سے جامد مولویت اور تقلید کے اکثر نظریوں کی از خود اصلاح ہوجاتی ہے۔ ضخامت ۱۹۴ صفحے۔ قیمت مجلد دو روپیہ، غیر مجلد ڈیڑھ روپیہ۔

غلامان اسلام

ندوۃالمصنفین کے سلسلے کی ساتویں کتاب جس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ اسلام نے غلاموں کا رتبہ کس درجہ بلند کیا اور ان میں کیسے کیسے جلیل‌القدر اہل علم و فضل پیدا ہوئے جن کو ملت اسلامی آج تک اپنے سب سے محبوب و محترم بزرگوں میں شمار کرتی ہے۔ کتاب میں ایسے چھہتر مشاہیر کے حالات نہایت مستند کتابوں سے جمع کیے گئے ہیں جن کا مطالعہ خود مسلمانوں کے واسطے دین و اخلاق

کا بہترین سبق ہے ۔ یہ زیادہ تر ابتدائی دو تین صدی کے اہل علم حضرات ہیں اور ابھی بعد کے نامور غلام خصوصاً ملوک و امرا کے حالات لکھنے کی نوبت نہیں آئی جن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے ۔ ہمیں خوشی ہوگی اگر لائق مولف مولانا سعید احمد صاحب ایم ۔ اے حسب وعدہ اس سلسلے کو انتہا تک پہنچادیں ۔ کتاب ۵۳۰ صفحات پر بہت عمدہ چھاپی گئی ہے اور اگر مغرب کے تحقیق و تنقید کے معیار کے مطابق نہ مانی جائے تو بھی کچھ شک نہیں کہ مفید معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ صحت نامے کے باوجود کتابت کی چھوٹی موٹی غلطیاں رہ گئی ہیں جو اردو خوانوں کے واسطے دشواری کا موجب ہوں گی۔ بہرحال کتاب قابل قدر ہے ۔ مجلد کی قیمت پانچ اور غیر مجلد کی ساڑھے چار روپیہ۔ ندوۃالمصنفین قرول باغ دھلی سے دستیاب ہوگی۔

اخلاق اور فلسفہ اخلاق

ندوۃالمصنفین (قرول باغ ، دھلی) کے سلسلہ مطبوعات کی آٹھویں کتاب ۔ مولفہ مولانا حفظ الرحمن صاحب سہواروی۔ ضخامت تقریباً ساڑھے پانسو صفحات۔ بڑی کتابی تقطیع قیمت غیر مجلد چار روپیہ آٹھ آنے مجلد پانچ روپیہ ۔

دیباچے میں لائق مولف لکھتے ہیں کہ اردو میں اسلامی اخلاق اور جدید مغربی فلسفۂ اخلاق پر علیحدہ علیحدہ کتابیں تو موجود ہیں، لیکن « وقت کا تقاضا یہ تھا کہ اس سلسلے میں ایک ایسی کتاب مرتب کی جائے جس میں ایک جانب جدید اکتشافات علمی کا مفید ذخیرہ محفوظ ہو اور زبردستی کے تعصب اور ہٹ دھرمی سے ان کے ساتھ معاندانہ روش اختیار نہ کی جائے اور دوسری جانب اسلامی اخلاقی تعلیم کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ صرف حسن ظن کی بنا پر نہیں بلکہ علمی دلائل و براھین کی روشنی میں اسلام کے نظریۂ اخلاق اور اسلامی تعلیمات کی برتری واضح ہوجائے » ۔ اس عمدہ مقصد کے لیے فاضل مولف نے مصری عالم شیخ محمد امین کی کتاب الاخلاق کو پسند فرمایا اور اپنے « تالیفی عطر کے لیے اسی کو زمین بنایا» ۔

کتاب اچھے کاغذ پر خوشخط اور بہت صاف ستھری چھپی ہے ۔ ابتدائی تین حصوں میں قدیم و جدید فلاسفہ کے نظریات پر بحث کی گئی ہے جن میں بعض

مباحث خوب مفصل اور دلچسپ ہیں اور بعض نسبۃً مجمل معلوم ہوتے ہیں - لائق مولف مغرب کے جدید فلاسفہ سے کچھ بہت زیادہ واقف نہیں ہیں لیکن اسلامی فلاسفہ کے بیان کو بھی کسی خاص اصول کے ساتھ ہر عنوان کے تحت میں تفصیل سے جمع کرنے کی بجائے حسب پسند ان کے مختلف اقوال و عقائد کو جگہ جگہ ملخصاً لکھنے پر اکتفا کی گئی ہے - آخری یعنی چوتھے حصے میں شاید کتاب کی طوالت سے گھبرا کر فاضل مولف نے بظاہر اختصار سے کام لیا ہے اور "علمی دلائل و براہین کی روشنی میں" اسلامی تعلیمات کی برتری واضح کرنے کا نیک ارادہ ہمارے خیال میں حسب دلخواہ پورا نہیں ہوسکا ہے - مولف کی محنت اور حسن نیت میں کچھ کلام نہیں اور خود موضوع کی وسعت کتاب کی کسی تشنگی کا معقول عذر ہوسکتی ہے - قدیم تعلیم یافتہ حضرات سے مغربی معیار تحقیق کے مطابق تالیف و تصنیف کی توقع رکھنا بھی ناموزوں معلوم ہوتا ہے - البتہ ہم سفارش کریں گے کہ کتاب پر احتیاط سے نظر ڈال کر ایک صحت‌نامہ اس میں چسپاں کرادیا جائے -

سیاسیات

مبادئ سیاسیات

تالیف پروفیسر ہارون خان صاحب شروانی (صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد) جس میں سیاسیات (جدید) کے تمام ضروری مسائل، یعنی حکومت کی قسمیں، حدود عمل، قانون ساز مجالس، بین‌الاقوامی قوانین وغیرہ کی حقیقت سمجھائی گئی ہے - طلبہ اور عام اردو خواں حضرات کے لیے بہت مفید کتاب ہے - پہلے دو حصوں میں شایع ہوئی تھی اور اب مکتبہ جامعہ ملیہ (دہلی) نے ایک مجلد کی صورت میں چھوٹی تقطیع کے ۶۰۷ صفحات پر شایع کیا ہے - جو نسخہ ہمیں تبصرے کے لیے بھیجا گیا ہے اس میں اصطلاحات کی فہرستیں بلکہ فہرست مضامین تک نظر نہیں آئی - غالباً شیرازہ‌بندی میں یہ ورق چھوٹ گئے -

متفرق

سوانح عمری

(یعنی بیگم شیخ عبداللہ کی زندگی کے حالات) تصنیف خان بہادر شیخ عبداللہ صاحب سکرٹری زنانہ کالج، علی گڑھ۔

جناب شیخ صاحب نے اس مختصر کتاب میں اپنی مرحومہ بیگم کے حالات زندگی کو بہت محبت اور خوبی سے بیان کیا ہے۔ ان کے تعلیمی کاموں کے سلسلے میں علی گڑھ کے زنانہ کالج کی ابتدا اور ترقی کے حالات بھی آگئے ہیں۔ کتاب کے شروع میں بیگم مرحومہ کی تصویر دی ہے۔ کتاب مرحومہ کی بہت اچھی یادگار ہے۔

چند سالنامے

ساقی کا سالنامہ حسب معمول بہت ضخیم اور دلچسپ ہے۔ پورے پون تین سو صفحے اور باسٹھ نثر کے مضامین اور کچھ نظمیں ہیں۔ نثر کا پلّہ ہر لحاظ سے بھاری ہے اور اس میں ہر قسم کے مضامین ہیں، ادبی، علمی، مزاحیہ اور فسانے وغیرہ۔ اور ان میں سے اکثر پڑھنے کے قابل ہیں۔ ساقی دھلی کا بہترین رسالہ ہے اور اردو کی قابل‌قدر خدمت کررھا ہے۔

ادبی دنیا خوب ترقی کررھا ہے۔ اس کا سالنامہ بھی طرح طرح کے مضامین سے معمور ہے۔ چودہ افسانے اور ڈرامے، اکیس علمی اور ادبی مضامین اور ۵۸ نظمیں اور چار رنگین تصویریں ہیں۔ پورا مجموعہ گلزار معلوم ہوتا ہے۔ رسالے کے اڈیٹر بڑی محنت سے اسے مرتب کرتے ہیں اور اسی میں اس کی مقبولیت ہے۔

رسالہ "سائنس" کا نیا دور

جنوری سنہ ۱۹۴۱ ع سے رسالہ "سائنس" بجائے تیسرے مہینے کے ماہانہ شائع ہونا شروع ہوگیا ہے۔ ضخامت قریباً ۶۴ صفحے، سالانہ قیمت پانچ روپے، ششماہی دو روپے آٹھ آنے اور نمونے کی قیمت آٹھ آنے۔

اس رسالے کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور دریافتیں ہورہی ہیں یا جو جدید انکشاف وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی‌الامکان سلیس اور عام فہم زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ اب اس رسالہ کا انتظام و مقام اشاعت دہلی سے حیدرآباد بدل کیا ہے۔ خریداری وغیرہ کے متعلق جملہ خط و کتابت اور ارسال زر ذیل کے پتہ پر ہونا چاہیے:—

معتمد مجلس ادارت رسالہ "سائنس"

جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن

نوٹ :— رسالہ سائنس (سہ ماہی) کے پرانے پرچے پہلے نمبر (جنوری سنہ ۱۹۲۸ ع) سے نمبر ۵۲ (اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ ع) تک دفتر انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی سے بہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے فی پرچہ (علاوہ محصول ڈاک) طلب فرمائیے۔

Vol. 21 APRIL 1941 No. 82

THE URDU

The Quarterly Journal
OF
The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

Edited by
ABDUL HAQ

Published by
The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)
Delhi.